محبت سے غفلت

رومانویت دنیا کی ہر زبان اور ہر قوم کی شاعری کا اہم ترین حصہ ہوتا ہے۔ بلکہ سچی بات یہ ہے کہ شاعری وجود ہی میں اس لیے آتی ہے کہ اپنے محبوب کے محاسن کو بیان کیا جائے اور اپنی محبت کا نذرانہ اس کے حضور پیش کیا جاسکے۔ یہ رومانوی شاعری محبت کے اس جذبے سے وجود میں آتی ہے جو ہر انسان کی فطرت میں ودیعت کیا گیا ہے۔ محبت کا یہ اظہار صرف صنف مخالف ہی کے لیے ظہور نہیں کرتا بلکہ اولاد کے لیے بے انتہا شفقت، والدین کی خدمت، بزرگوں کی عقیدت اور دوست احباب کی رفاقت کے ان گنت رنگوں سے زندگی کو سجاتا رہتا ہے۔

تاہم یہ بڑی حیرت کی بات ہے کہ اپنے خالق و مالک اور پروردگار کے معاملے میں یوں لگتا ہے کہ اکثر انسان اس جذبے سے واقف ہی نہیں۔ محبت میں انسان کسی کے جمال کی تعریف میں الفاظ کے تاج محل تخلیق کرتا ہے، مگر خدا کی زندہ وجاوید حمد تو دور کی بات ہے اس کی ہر نعمت کے مزے لوٹنے والے اس کا شکریہ ادا کرنے کی زحمت بھی گوارا نہیں کرتے۔ محبت کسی کی یاد میں تڑپنے اور بے قرار رہنے کا نام ہے، یہاں حال یہ ہے کہ عین نماز میں خدا یاد نہیں رہتا۔

محبت کسی کے لیے اپنا دل اور اپنی جان نذر کردینے کا مطالبہ کرتی ہے، مگر ہم میں سے کسی نے شاید ہی کبھی دو جملے بول کر اللہ تعالیٰ کو یقین دلایا ہو کہ میرا جینا اور مرنا آپ کے لیے ہے۔ محبت قربانی اور وفا کا تقاضہ کرتی ہے، ہم فجر میں اٹھنا ناممکن سمجھتے ہیں۔ محبت اپنی ہستی اور اپنی انا کو فنا کردینے کا نام ہے، مگر ہم خدا کے بجائے اپنی انانیت، فرقہ اور تعصّبات کا جھنڈا بلند کرنا دینداری سمجھتے ہیں۔

آہ! اس کائنات میں انسان واحد ہستی ہے جو خدا سے محبت کرنے اور اظہار محبت کے ہر طریقے پر قدرت رکھتا ہے۔ مگر آہ کہ انسان ہی اس محبت سے سب سے بڑھ کر غافل ہے۔

علم نافع

احادیث کے نام سے جو ذخیرہ اس وقت مسلمانوں کے پاس موجود ہے اس میں غالباً سب سے زیادہ قیمتی چیز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعائیں ہیں۔ امام مسلم نے ایسی ہی ایک بے مثال دعا اپنی صحیح میں نقل کی ہے۔ اس دعا کا ایک جز درج ذیل ہے:

اللهم انی اعوذبك من علم لا ينفع

اے اللہ میں اس علم سے تیری پناہ مانگتا ہوں جو فائدہ مند نہ ہو، (مسلم، رقم 2722)

علم کئی پہلوؤں سے غیر نافع ہوسکتا ہے۔ مگر ان میں سب سے زیادہ تباہ کن پہلو یہ ہے کہ انسان علم حاصل کرے اور یہ علم اس کی شخصیت میں کوئی ارتقا پیدا نہ کرے۔ اس کی مثال ایسی ہی ہے کہ ایک بچہ خوراک کھائے مگر یہ غذا جزو بدن نہ بنے اور بچے کی نشو ونما رک جائے۔ جس کے بعد والدین فوراً بچے کو ڈاکٹر کے پاس لے کر جائیں گے۔ ڈاکٹر پہلے مرحلے پر بچے کے نظام ہاضمہ کا جائزہ لے کر یہ دیکھے گا کہ غذا ہضم کیوں نہیں ہو رہی۔ کیونکہ یہی مسئلے کی جڑ ہے۔

علم کا معاملہ بھی مختلف نہیں۔ علم بلا واسطہ یا بالواسطہ شخصیت کو بہتر بناتا ہے۔ مگر یہ صرف ان لوگوں کے ساتھ ہوتا ہے جو غور وفکر کی صلاحیت استعمال کر کے اس علم کو ہضم کریں اور اسے قیمتی اسباق میں تبدیل کریں۔ جبکہ دوسرے لوگوں کو یا تو علم کا قبض یا پھر علمی اسہال ہو جاتے ہیں۔ پہلی قسم کے لوگ جو پڑھتے سنتے ہیں وہ ان کے دماغ تک محدود رہتا ہے۔ یہ علمی قبض علم کو شخصیت تک منتقل نہیں ہونے دیتا۔ جبکہ علمی اسہال میں انسان جو سیکھتا ہے منہ کے راستے دوسروں پر خارج کر دیتا ہے، خود کچھ نہیں کرتا۔ ایسے لوگوں کی شخصیت میں بھی ارتقا نہیں ہو پاتا۔

علم نافع دراصل علم کو اسباق میں بدلنے اور اپنی فکر اور شخصیت کو اس کے مطابق ڈھالنے کا نام ہے۔ ورنہ کتنی ہی کتابیں پڑھ لی جائیں اور کتنے ہی لیکچر سن لیے جائیں، سب بے کار ہیں۔

صاحب الرائے

پاکستانی قوم اس اعتبار سے بڑی زرخیز ہے کہ جتنے ''صاحب الرائے'' لوگ اس قوم میں پائے جاتے ہیں، شاید دنیا کی کسی قوم میں نہیں پائے جاتے۔ یہ شاید دنیا کی واحد قوم ہے جس میں ایک مزدور، پھیری لگانے والا بھی ہر معاملے میں صاحب الرائے ہوتا ہے۔

اس کا سبب یہ ہے کہ ہمارے ملک میں صاحب الرائے ہونے کی واحد شرط یہ ہے کہ رائے دینے والے کے جذبات بے قابو ہوجائیں۔ جذبات سے مغلوب ہونے کے بعد ہمارے ہاں کے صاحب الرائے دنیا کے کسی بھی معاملے میں پورے اعتماد سے گفتگو شروع کردیتے ہیں۔ ملکی و بین الاقوامی سیاست سے لے کر قرآن و حدیث کے فہم تک کسی بھی مسئلے پہ ایسے گفتگو کرتے ہیں کہ گویا ساری زندگی اسی مسئلے پر فکر و تحقیق کرتے ہوئے گزری ہے۔

جذباتی ''صاحب الرائے'' سے زیادہ اعتماد ان لوگوں کو ہوتا ہے جو سطحی انداز اور ابتدائی سطح پر اپنے ہی جذباتی نقطہ نظر کی تائید میں کچھ چیزیں پڑھ یا سن لیتے ہیں۔ اس کے بعد جس اعتماد سے گفتگو ہوتی ہے اس کا حال نہ پوچھیے۔ کس طرح کسی علم و فن کے ماہرین جن کی ساری زندگی علم و تحقیق میں گزرتی ہے کی پرمغز باتوں کو چٹکیوں میں اڑایا جاتا ہے اور کس طرح برہنہ حقائق کو اپنے جذبات کے خلاف پا کر ان کا چہرہ ہی بدلنے کی کوشش کی جاتی ہے۔

جبکہ حقیقت یہ ہے کہ صاحب الرائے ہونا یا کسی معاملے میں رائے دینا بڑی ذمہ داری کا کام ہے۔ اس کے لیے بنیادی شرط یہ ہے کہ انسان اپنے جذبات و تعصّبات سے بلند ہوکر خالص علمی انداز میں غور کرنے کی صلاحیت رکھتا ہو۔ اسے معاملے کے تمام پہلوؤں سے آگاہی حاصل ہو۔ وہ کسی کے لکھے یا بولے ہوئے الفاظ کا تجزیہ کرنے کی بھرپور صلاحیت رکھتا ہو۔ وہ کسی صورتحال کے پس منظر اور پیش منظر سے بخوبی واقف ہو۔ جو شخص یہ صلاحیت نہیں رکھتا اسے خاموش رہنا چاہیے۔ اس کے سوا ہر راستہ روز قیامت اپنی جوابدہی میں اضافے کا راستہ ہے۔

میرے شوق کی بلندی میرے حوصلے کی پستی

میں ایک مسلمان ہوں۔ مسلمانوں کے گھر پیدا ہوا۔ اسلام میرا نسلی مذہب ہے اور اسی لیے جنت میرا مقدر ہے۔ مگر میرا یہ اعتماد بلا وجہ نہیں۔ میں اسلام کے خلاف ہونے والی ہر سازش کو بے نقاب کرنا اپنا فرض سمجھتا ہوں۔ ہر فتنے سے مسلمانوں کو بچانے کے لیے سرگرم رہتا ہوں۔ ہاں عدل، احسان، انفاق کرنے اور فواحش، منکرات اور ظلم و زیادتی سے روکنے والی اسلامی تعلیمات پر عمل کرنا مجھے ذرا مشکل لگتا ہے۔ لیکن الحمدللہ یہ کوئی بڑا مسئلہ نہیں۔

مجھے پیغمبر اسلام علیہ السلام سے والہانہ عشق ہے۔ درود و سلام کے بغیر میں اپنے آقا کا ذکر نہیں کرسکتا۔ مگر قربانی، ایثار، صبر اور درگزر پر مبنی آپ کے اخلاق عالیہ مجھے پہاڑ کی وہ چوٹی محسوس ہوتے ہیں جس پر چڑھنا بہت مشکل ہے۔ بھلا بتائیے پہاڑ پر چڑھنا بھی کوئی کرنے کا کام ہے۔ ویسے بھی جنت صراط مستقیم پر چلنے سے ملتی ہے، پہاڑ پر چڑھنے سے نہیں۔

مجھے اللہ پر کامل ایمان ہے۔ اتنا ایمان کہ میں مشرکانہ سوچ رکھنے والے ہر شخص کو جہنمی سمجھتا ہوں۔ مگر اس کی یاد اور اس کا شوق، اس کے بندوں پر رحم اور ان سے ہمدردی مجھے کرنے کا کوئی کام نہیں لگتا۔ مجھے یقین ہے کہ دین اسلام کا پیغام ساری دنیا کے لیے۔ انسانیت کے پاس اسلام کے سوا سچائی کو پانے کا کوئی ذریعہ ہی نہیں۔ مگر دعوت دین کا کام مجھے ایک پتھریلا راستہ محسوس ہوتا ہے۔ خود سوچیے کہ پتھروں پر چلنا بھی کوئی معقول طریقہ ہے۔

کل مجھے ایک پرانا دوست ملا۔ اس کے خیالات بالکل میرے جیسے تھے۔ مگر وہ بہت دکھی تھا۔ میں نے غم کا سبب پوچھا تو یہ شعر سنا کر چلا گیا:

غمِ زندگی کا حسرتؔ سبب اور کیا بتاؤں
میرے شوق کی بلندی میرے حوصلے کی پستی

دوسروں کا گند

ٹیکسی ڈرائیور کی زبان سے نکلی ہوئی گالی اتنی غلیظ تھی کہ کانوں سے دماغ تک جانے والی ہر رگ مجھے آلودہ ہوتی محسوس ہوئی۔ غلطی سامنے والے کی تھی، اس ٹیکسی والے کی نہیں جس میں میں بیٹھا ہوا تھا۔ ٹیکسی ڈرائیور نے اسے تنبیہ کی تو وہ ایک گالی دیتا ہوا آگے بڑھ گیا۔ جواب میں ٹیکسی ڈرائیور نے جو کچھ کہا وہ کوئی قلم رقم کرنا چاہے گا نہ کوئی کان اسے سننا چاہے گا۔

تاہم ڈرائیور کو احساس ہو گیا کہ گاڑی میں کوئی اور بھی ہے۔ وہ اپنی زبان کے گند کو تاویل کی جھاڑو سے صاف کرنے لگا۔ وہ مجھے سمجھانے لگا کہ سامنے والے کی کیا غلطی تھی۔ اور یہ کہ آج کل سب لوگ ایسے ہی غلطی کر کے دوسروں کو غلط کہتے ہیں۔ اس نے کچھ وقفہ لیا تو میں نے پوچھا:

''کوئی آدمی اگر راستے میں بیٹھ کر فضلات خارج کرنے لگے تو کیا تم اسے اپنے منہ میں ڈالو گے یا اپنے کپڑوں سے پوچھو گے۔''، میرا سوال بالکل غیر متوقع تھا۔ وہ سٹ پٹا کر بولا:

''وہ الگ بات ہے۔ اِس نے تو......''، میں نے اسے بات پوری نہیں کرنے دی۔

''الگ بات صرف یہ تھی کہ اس نے اپنا گند منہ سے نکالا تھا۔ مگر تم نے اس گند کو اپنے منہ میں ڈال لیا۔ تم سمجھتے ہو کہ تم نے غصہ اتار دیا۔ مگر جو گند تم نے اپنی زبان سے ذہن تک پہنچایا ہے وہ کیسے صاف ہو گا؟

ٹیکسی ڈرائیور شاید ٹی وی کے ٹاک شو نہیں دیکھتا تھا جہاں اپنی ہر غلطی کو درست ثابت کرنا اہل صحافت اور اہل سیاست کے فن کا کمال سمجھا جاتا ہے۔ وہ خاموشی سے بولا:

''بس غصہ آ گیا۔ مگر آپ ٹھیک بولتا ہے۔ گندے آدمی کی بات کا کیا جواب دینا۔''

میں نے سوچا کہ کاش ہم یہ سبق سیکھ لیں کہ کسی کے گند سے خود کو گندا کرنا حماقت ہے۔ مگر شاید اس کے لیے صبر کی جو صلاحیت چاہیے وہ ہم میں بہت کم ہے۔

ولن کی تلاش

منفی سوچ کے لوگ زندگی بھر کسی نہ کسی ولن کی تلاش میں رہتے ہیں۔ یہ وہ ولن ہوتا ہے جس پر وہ اپنی ہرناکامی اور ہرشکست کا ملبہ ڈال کر مطمئن ہوجاتے ہیں۔اس مزاج کے لوگ جب کسی قوم کے سر پر لیڈر بن کر مسلط ہوجائیں تو پھر وہ پوری قوم کو ولن کی تلاش میں لگا دیتے ہیں۔اس کے بعد قوم کے ہر مسئلے اور پریشانی کا سبب کوئی اور قوم یا گروہ بن جاتا ہے جس کا کام صرف سازشیں کرنا اور انھیں نقصان پہنچانا ہوتا ہے۔

اس کا مطلب یہ نہیں کہ اس دنیا میں ولن نہیں پائے جاتے۔ بلاشبہ اس دنیا میں ولن اور دشمن پائے جاتے ہیں مگر انھیں کامیابی ان کی کوششوں سے زیادہ ہماری کمزوریوں کی بنا پر ملتی ہے۔اس کی سب سے بڑی مثال شیطان ہے۔ وہ انسان کا کھلا دشمن ہے۔مگر اس کے باجود قرآن کریم جگہ جگہ واضح کرتا ہے کہ اسے اختیار صرف انھیں لوگوں پر حاصل ہوتا ہے جو اپنی باگ اس کے حوالے کردیتے ہیں۔ جو نفسانی خواہشات کی پیروی ،تکبر اور تعصب جیسے اخلاقی جرائم کے مرتکب ہوتے ہیں۔

یہی معاملہ ان افراد اور اقوام کا ہے جو ہمارے اطراف میں رہ کر ہمیں نقصان پہنچانے کی کوشش کرتی ہیں۔ یہ ان کی کوششیں نہیں جو انھیں کامیاب کرتی ہیں بلکہ ہماری حماقتیں اور کمزوریاں ہیں جو ہمیں نامراد کرتی ہیں۔اس لیے عقلمند وہ ہے جس کی ساری توجہ کسی ولن کو تلاش کرکے اس پر الزام ڈالنے کے بجائے اپنی کمزوریوں کو تلاش کرکے انھیں دور کرنے پر مرکوز رہے۔ رہے ولن ڈھونڈنے والے تو بربادی کے سوا ان کا مقدر اور کچھ نہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ خدا کی دنیا میں ولن تلاش کرنا ہی ایک جرم ہے۔ یہ اپنی شکست آپ تسلیم کرنے کے مترادف ہے۔جس کے بعد زندگی کبھی آپ کے لیے ترقی کی راہ نہیں کھولے گی۔

کنفیوژن کا انجام

قرآن مجید میں جگہ جگہ کفار کی ایک صفت ''مریب'' کے عنوان سے بیان کی گئی ہے۔ عام طور پر اس کا ترجمہ مبتلائے شک کیا جاتا ہے۔ مگر قرآن مجید نے تقریباً ہر جگہ اس لفظ کو ''شک'' کے ساتھ استعمال کیا ہے۔ جس کے بعد ''مریب'' کا مفہوم وہی بن جاتا ہے جسے آج کل کنفیوژن کہا جاتا ہے۔ یہ کنفیوژن یا الجھن انسان کو سچائی کو قبول کرنے سے روک دیتی ہے۔ چنانچہ ایسے ''مریب'' شخص کا انجام قرآن مجید کے مطابق جہنم ہے، (ق 50:25)۔ ساتھ میں قرآن مجید اپنے آغاز میں یہ بھی واضح کر دیتا ہے کہ اس کتاب میں کوئی شک نہیں۔ اس کے باوجود قرآن کے مخاطبین شک اور کنفیوژن میں پڑے رہے یہاں تک کہ جہنم میں جا پہنچے۔

انسان کے کنفیوژن کی بنا پر اس انجام کو پہنچنے کا سبب ایک ہی ہوتا ہے۔ وہ یہ کہ انسان واضح ترین حقائق کو اپنے تعصّبات کی بنا پر ماننا نہیں چاہتا۔ مگر وہ حقائق ایسے صریح ہوتے ہیں کہ انسان انکار بھی نہیں کر سکتا۔ چنانچہ انسان گومگو کی کیفیت میں مبتلا رہتا ہے۔ مگر جیسا کہ سورہ ق کی آیت سے واضح ہے اس گومگو کو اللہ تعالیٰ بطور عذر قبول نہیں کریں گے اور ایسے لوگوں کو جہنم کی سزا سنائیں گے۔

یہ وہ لوگ ہوں گے جن کے سامنے توحید کو آخری درجے میں واضح کر دیا جاتا ہے۔ لیکن ان کے تعصّبات انھیں گھما پھرا کر شرک کی طرف لے جاتے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہوتے ہیں جن کے سامنے بے گناہ اور معصوم بچوں اور عورتوں اور مردوں کا قتل عام برپا ہوتا ہے۔ مگر وہ اپنے تعصّبات کی بنا پر فیصلہ ہی نہیں کر پاتے کہ بے گناہ مقتول مظلوم ہے یا سفاکی سے قتل کر دینے والا مظلوم ہے۔

قران مجید بالکل واضح ہے۔ ایسے کھلے ہوئے، واضح اور برہنہ حقائق کو دیکھ کر بھی کنفیوژ رہ جانے والے لوگوں کا انجام جہنم کی آگ کے سوا کچھ نہیں۔ چاہے وہ اپنے آپ کو کچھ بھی سمجھتے رہیں۔ چاہے وہ اپنے آپ کو کچھ بھی بتاتے رہیں۔

اہل محبت اور اہل ہوس

قرآن کہتا ہے کہ ایمان والے سب سے بڑھ کر اللہ سے محبت کرتے ہیں۔ اللہ کو بھول کر اپنی ذات کی محبت میں گم، مال و دولت کے طلبگار، حب جاہ سے سرشار، قومی تعصّبات میں گرفتار، فرقہ واریت کے اسیر اور غیر اللہ کی محبت میں جینے والے کسی شخص کو یہ بات کبھی سمجھ نہیں آسکتی کہ اللہ سے سب سے بڑھ کر محبت کیسے کی جاتی ہے۔ ہاں اگر کوئی شخص ان چیزوں سے بلند ہونے کے لیے تیار ہو جائے تو اسے سمجھایا جاسکتا ہے کہ یہ محبت کیا ہوتی ہے۔

یہ محبت محفل اور تنہائی ہر جگہ انسان کو اللہ ہی کی یاد دلاتی ہے۔ وہ غیر اللہ کی یاد میں جینے والوں اور غفلت کے ماروں کو اللہ کی یاد دلاتا ہے۔ یہاں تک کہ لوگ اسے دیوانہ اور سودائی سمجھنے لگتے ہیں۔ مگر اسے اس کی کوئی پروا نہیں ہوتی کہ دنیا اسے کیا کہتی اور کیا سمجھتی ہے۔

ایسا بندہ ہر رنگ میں خدا کا جمال، ہر ساز میں اس کی صدا، ہر نغمے میں خدا کی آواز اور ہر مہک میں عنایت الٰہی کا پہلو تلاش کر لیتا ہے۔ لوگ اسے طعنے دیتے ہیں کہ تم اپنی شراب طہور نہ خود پی سکتے ہو اور نہ کسی کو پلا سکتے ہو، مگر نہیں جانتے کہ وہ ہر لمحہ شراب طہور پی رہا ہوتا ہے اور کسی میں دل ہو تو اسے پلا سکتا ہے۔ لوگ اسے موت سے خوف کے طعنے دیتے ہیں، مگر وہ خدا کے لیے جیتا اور اسی آس پر جیتا ہے کہ ایک روز اسے راہ خدا میں موت آجائے۔ وہ ہر مخالفت، ہر الزام، ہر بہتان کو اللہ کے لیے جھیلتا چلا جاتا ہے، مگر اخلاق کی سطح سے گر کر کبھی کسی کو جواب نہیں دیتا کہ یہ محبت کے نام کی سب سے بڑی رسوائی ہے۔

یہ محبت اس کا دعویٰ نہیں، اس کی زندگی ہوتی ہے۔ اس کا نعرہ نہیں، اس کا عمل ہوتی ہے۔ اس کی تقریر نہیں اس کی تصویر ہوتی ہے۔ اس کی صورت نہیں، اس کی سیرت ہوتی ہے۔ اس محبت کے نمونے اگر دیکھنے ہیں تو یہ سب سے بڑھ کر پیغمبروں کی زندگی میں نظر آتے ہیں۔

یہ نوح ہیں۔ ہزار برس گزار دیے مگر قوم کفر سے باز نہ آئی۔ یہ وقت آ گیا کہ بال سفید ہو گئے۔ کمر خمیدہ ہو گئی۔ نئی نسلیں ان کی دعوت کا جواب تمسخر اور استہزا سے دیتی ہیں۔ انھیں دیوانہ بڈھا کہا جاتا ہے۔ مگر بڑے صبر کے ساتھ ہر الزام اور تمسخر سہتے رہے۔

یہ ابراہیم ہیں۔ زندگی بھر راہ خدا میں لگا دی۔ بیوی اور بھتیجے کے سوا کوئی ایمان نہ لایا۔ بڑھاپے کی انتہا کو پہنچ کر بڑی مرادوں سے اولاد ملی۔ اکلوتا فرزند اور کیا خوب فرزند اسماعیل۔ حکم ہوا۔ ذبح کر دو۔ بغیر ہچکچاہٹ کے بیٹے کو چھری کے نیچے لٹا دیا اور بیٹا بخوشی لیٹ گیا۔

یہ موسیٰ ہیں۔ عیش و عشرت میں پلنے والے شہزادے۔ ایک مظلوم کی مدد کے لیے سب کچھ چھوڑ دیا۔ حکم ملا تو دنیا کی طاقتور ترین سپر پاور کے حکمران کے سامنے تن تنہا ڈٹ گئے۔ اپنی قوم نے بار بار دغا کی، مگر یہ پیکر وفا ہمیشہ وفاداری میں جیا اور اسی میں دنیا سے رخصت ہو گیا۔

یہ داؤد ہیں۔ ایسے بہادر کہ جالوت جیسا جنگجو نہ ٹک سکا اور ایسے موسیقار کہ ان کی حمد یہ مزمور پر پہاڑ اور پرندے اور کل کائنات جھوم اٹھتی۔ مگر پہلے وقت کے بادشاہ کے ستم کا شکار ہوئے اور جب خود باشاہ بن گئے تو قوم نے ان پر ہی بدکاری کا الزام لگایا اور منصب نبوت سے فارغ کر دیا۔ مگر کوئی الزام انہیں صداقت کی راہ سے باز نہ رکھ سکا۔

یہ عیسیٰ ہیں۔ خدا کے نام پر کھڑے پتھر دل مذہبی رہنماؤں کے مقابلے میں ڈٹ گئے۔ اس راہ میں کبھی کسی بہتان تراش کی پروا نہیں کی اور ہر دشمن حق کو بے نقاب کر کے چھوڑا۔

اور یہ خاتم النبین ہیں۔ گالیاں، الزام، بہتان، پتھر، دشمنی، نفرت، عداوت سب جھیلا مگر کبھی حرف شکایت زبان پر نہیں آیا۔ زندگی بندگی رہی۔ اسے یاد کرتے رہے اسے یاد دلاتے رہے۔

یہ ہوتی ہے محبت اور ایسے ہوتے ہیں اہل محبت۔ اب کسی میں حوصلہ ہے تو اہل ہوس کی صفوں سے نکلے اور اہل محبت کے گروہ میں شامل ہو کہ یہی نجات والوں کا گروہ ہے۔

سابقہ کتب اور مسلمان

قرآن مجید نے اپنے ماننے والوں سے جن عقائد پر ایمان لانے کا مطالبہ کیا ہے ان میں سے ایک بنیادی مطالبہ یہ ہے کہ وہ تمام انبیا پر اور ان پر اترنے والی کتابوں پر ایمان لائیں گے۔ قرآن مجید نے جگہ جگہ سابقہ انبیا اور ان کی تعلیمات کا ذکر کیا اور اس بات کو واضح کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نیا دین لے کر نہیں آئے بلکہ آپ کی ہستی سابقہ انبیا ہی کا تسلسل ہے۔

چنانچہ یہی سبب ہے کہ بالعموم مسلمان دیگر انبیا کا بھی ادب و احترام کرتے ہیں۔ تاہم ان انبیا کی کتابوں کے حوالے سے مسلمانوں میں ایک بڑی غلط فہمی عام ہو چکی ہے۔ وہ یہ کہ ان کتابوں میں جو کچھ ہے وہ غلط ہے کیونکہ ان کتابوں میں مکمل تحریف ہو چکی ہے۔ حالانکہ تاریخی اور واقعاتی طور پر بس اتنی بات ٹھیک ہے کہ اہل کتاب نے اپنی کتابوں میں اصل تحریف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی آمد کی پیش گوئیوں اور حضرت ابراہیم کے حرم کعبہ کے تعلق کے حوالے سے کی ہیں۔ اس کے علاوہ جو تحریفات پائی جاتی ہیں وہ غالباً جان بوجھ کر نہیں کی گئی بلکہ انھوں نے اپنی تاریخی داستانوں اور سنی سنائی باتوں کو بطور تفسیر بیان کرنے کے اپنی اصل کتاب میں داخل کر دیا۔ قرآن مجید کے برعکس جس میں اصل وحی اور تفسیر الگ الگ رہتے ہیں بائبل میں ان دونوں کو ملا دیا گیا ہے۔ اور یہ سب کچھ نزول قرآن سے پہلے ہی ہو چکا تھا۔

چنانچہ مسلمان مفسرین قدیم کتب میں تحریف کی داستان جب سناتے ہیں تو واضح کر دیتے ہیں کہ یہ سب کچھ نزول قرآن سے پہلے ہو چکا تھا۔ بعد میں جو کچھ ہوا وہ یہ تھا کہ انھوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں پیش گوئیوں کو ترجمے کے ذریعے سے بدل دیا۔

چنانچہ اس پس منظر میں یہ ایک دلچسپ حقیقت ہے کہ جس وقت قرآن مجید نازل ہو رہا تھا یہ دوسری قسم کی ساری تحریفات پچھلی کتابوں میں موجود تھیں۔ مگر اس کے باجود اللہ نے مسلمانوں کو

ان کتابوں پر ایمان لانے کا نہ صرف حکم دیا بلکہ ان میں موجود واقعات اور بیانات میں سے کچھ کی تصحیح کر کے اور کچھ کو بعینہٖ بیان کر دیا ہے۔

یہ گویا کہ وہی عمل ہے جسے مسلمان اہل علم نے احادیث کے معاملے میں سرانجام دیا ہے۔ قرون اولیٰ میں جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے نام پر جھوٹ گھڑا جانے لگا یا آپ کی باتوں میں تحریف و اضافہ کرنے کی کوشش کی گئی تو مسلمانوں نے احادیث کو بالکلیہ رد کرنے کے بجائے قرآن مجید کا طریقہ اختیار کیا اور کوشش کی کہ ہر ضعیف، موضوع، منکر روایت کی نشان دہی کر دی جائے۔ جو باتیں علمی معیارات پر ٹھیک اترتی ہیں ان کو بیان کر دیا جائے اور جھوٹے اضافوں کو رد کر کے جہاں اصل بات موجود ہے اسے بیان کرنے کی کوشش کی جائے۔

ضرورت ہے کہ مسلمان یہی رویہ دیگر انبیا کی تعلیمات کے معاملے میں اختیار کریں۔ مسلمانوں کے پاس قرآن و سنت کی وہ کسوٹی موجود ہے جس کی بنیاد پر پرکھ کر یہ دیکھا جا سکتا ہے کہ سابقہ انبیا کی تعلیمات کا کون سا حصہ درست ہے اور کس میں تحریف ہو چکی ہے۔ کس حصے کو لیا جا سکتا ہے اور کسے چھوڑ دینا چاہیے۔

یہاں ایک شخص یہ اعتراض کر سکتا ہے کہ ہمیں سابقہ انبیا کی تعلیمات کی ضرورت ہی کیا ہے۔ بلکہ بہتر یہ ہے کہ ان سے دور ہی رہا جائے۔ ہمارے نزدیک کئی وجوہات کی بنا پر یہ رویہ غلط ہے۔ پہلا یہ کہ مسلمانوں کے اس رویے کی بنا پر چودہ سو برس میں تورات، زبور اور انجیل میں نبی کریم کی متعدد پیش گوئیوں کو بدل دیا گیا ہے۔ اگر مسلمان ان کتابوں کو اپنی کتابیں سمجھ کر محفوظ کر لیتے تو یہود و نصاریٰ پر اسلام کی سچائی ثابت کرنا بہت آسان ہو جاتا۔ آج بھی کوشش کی جائے تو آپ کی کئی پیش گوئیوں کو کتب قدیم سے واضح کیا جا سکتا ہے جو ابھی تک سامنے نہیں آئی ہیں۔ ایسی ہی ایک پیش گوئی زبور کے حوالے سے اس ماہ کے رسالے میں زیر بحث ہے۔

دوسرا یہ کہ یہ صرف شریعت محمدی علی صاحبھا السلام ہے جس میں مسلمانوں پر لازم ہے کہ

آپ کے علاوہ کسی اور کی پیروی نہ کریں، باقی معاملات میں تو حال یہ ہے کہ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ نے یہ صاف حکم دیا تھا کہ ملت ابراہیم (النحل 123:16) اور انبیا سابقہ کے طریقے کی پیروی کریں، (الانعام 90:6)۔ عام علما اس حکم سے کیسے بے نیاز رہ سکتے ہیں۔

تیسری بات یہ ہے کہ حکمت بندہ مومن کی متاع گمشدہ ہے۔ اسی اصول پر ہم بزرگوں کے اقوال سے استفادہ کرتے ہیں خواہ وہ ہماری اپنی قوم کے ہوں یا دوسری تہذیب کے۔ سوال یہ ہے کہ کیا حضرات انبیا کی ہمارے نزدیک یہ حیثیت بھی نہیں ہے کہ ان کی بات کو ان کی اپنی کتابوں سے لیا جائے جبکہ ان کی متعدد باتیں، دعائیں، اقوال اور واقعات خود قرآن وحدیث میں بیان ہوئے ہیں۔

اگلی بات یہ ہے کہ مسلمان اس وقت دور زوال میں ہیں۔ اس کا کوئی ماڈل زمانہ رسالت، نزول قرآن اور عہد صحابہ میں نہیں ملتا۔ نہ قرآن وحدیث میں براہ راست اسے موضوع بنایا گیا ہے۔ بلکہ درحقیقت جتنا موضوع بنایا ہے قدیم اقوام اور قدیم کتب کے حوالے سے بنایا گیا ہے۔ کیونکہ بنی اسرائیل ہی وہ گروہ ہے جو نزول قرآن سے قبل ہمارے جیسے دور زوال سے گزرا تھا۔ چنانچہ اس وقت ان کے انبیا نے جو کچھ کہا اور جو کچھ سمجھایا اور جس کا اجمالی ذکر خود قرآن میں بھی آیا ہے، اس سے بڑھ کر اس وقت ہمارے لیے کوئی رہنمائی نہیں۔ یہ رہنمائی تفصیلی طور پر صرف قدیم صحف سماویہ ہی میں مل سکتی ہے۔

ان تمام وجوہات کی بنا پر ہم سمجھتے ہیں کہ مسلمان علما کو قدیم کتابوں کی طرف رجوع کرنا چاہیے اور انبیا سابقہ کی تعلیمات کو گہرائی میں جا کر سمجھنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ یہ بات طے ہے کہ اب ہم قرآن وحدیث کے ذخیرے سے محروم نہیں ہو سکتے۔ مگر ہم نے غفلت کا مظاہرہ کیا تو دیگر انبیا کی تعلیمات میں جو انتہائی قیمتی مواد دعوتی اور تربیتی پہلو سے دستیاب ہے، اس سے ہم ضرور ہاتھ دھو بیٹھیں گے۔

حضرت عمر اور تورات

مسلمانوں میں ایک روایت بہت مشہور ہوگئی ہے جس کی بنا پر یہ خیال عام ہے کہ سابقہ انبیا کی کتب کا مطالعہ گناہ ہے۔ روایت کے مطابق ایک دفعہ حضرت عمر نے تورات کا ایک نسخہ عربی میں لکھا اور حضور کے پاس لا کر سنانے لگے جس پر آپ کے چہرے کا رنگ متغیر ہوگیا۔ بعض انصار یا ایک روایت کے مطابق حضرت ابوبکر نے آپ کو توجہ دلائی کہ رسول اللہ علیہ وسلم کا چہرہ تو دیکھ لو۔ اس کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی ناراضی کا اظہار کیا اور فرمایا کہ اگر موسیٰ بھی اس وقت ہوتے تو میری ہی پیروی کرتے۔ مگر درحقیقت یہ ایک ضعیف روایت ہے۔ اس کا ایک راوی جابر الجعفی متہم بالکذب ہے جس کے بعد یہ روایت کوئی حیثیت نہیں رکھتی۔

بالفرض اس روایت کی کوئی حقیقت ہوتی تب بھی زیادہ سے زیادہ یہی ثابت ہوتا کہ آخری شریعت کے بعد کسی اور شریعت کی پیروی جائز نہیں۔ اگر موسیٰ بھی اس وقت ہوتے تو میری ہی پیروی کرتے کے الفاظ سے یہی بات واضح ہوتی ہے۔ ظاہر ہے کہ اس پہلو سے یہ ممکن نہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا کسی اور کی طرف دیکھا جائے چاہے وہ کوئی نبی ہی کیوں نہ ہو۔

مزید یہ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں قرآن مجید کا نزول ہو رہا تھا۔ اس وقت سب سے بڑا کام قرآن مجید کو محفوظ کرنا تھا۔ اس لیے احادیث تک کو لکھنے کی اجازت نہیں دی گئی۔ ایسے زمانے میں حضرت عمر جیسے آدمی کا قرآن کے بجائے کسی اور چیز میں لگنا کسی صورت درست نہیں تھا۔ چنانچہ کسی پہلو سے بھی یہ روایت کوئی اصولی ہدایت نہیں دیتی۔

یہی وہ پس منظر ہے جس میں دور صحابہ سے لے کر آج تک اہل علم قدیم صحف سماویہ کو پڑھتے اور نقل کرتے آئے ہیں۔ چنانچہ آج بھی کسی طالب علم کا قدیم کتابوں سے دین حق کی سچائی اور کسی نصیحت اور نیکی کی بات کا نقل کرنا کسی پہلو سے غلط نہیں۔

سوال و جواب

ابو یحییٰ

شیر سے بھاگنے والے گدھے

سوال: السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

چونکہ آپ ماشاء اللہ قرآنیات میں بہت ذوق رکھتے ہیں، اس لیے یہ سوال آپ سے دریافت کرنے کا خیال آیا۔ بات یہ ہے کہ آج کل ذہن میں یہ سوال پیدا ہو رہا ہے کہ قرآن مجید نے نصیحت کی باتوں سے جان چھڑانے والوں کو شیر سے بدکے ہوئے گدھوں سے تشبیہ دی ہے۔ مگر شکاریات کے ضمن میں میرے خیال میں یہ تمثیل عجیب محسوس ہوگی کیونکہ گدھے کو شیر سے بدکنے کا موقع ہی کب ملے گا۔ اللہ تعالی آپ پر اپنی خصوصی رحمت فرمائیں۔

جواب:

وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

جس آیہ مبارکہ کی طرف آپ نے اشارہ کیا ہے وہ سورہ مدثر کی درج ذیل آیت ہے۔

”ان کو کیا ہوا ہے کہ نصیحت سے روگرداں ہو رہے ہیں۔ گویا گدھے ہیں کہ بدک جاتے ہیں۔ (یعنی) شیر سے ڈر کر بھاگ جاتے ہیں۔“، (المدثر 51-49)

یہاں کفار کے قرآن مجید سے اعراض کے رویے کے بیان کے لیے دراصل تمثیل کا اسلوب استعمال ہوا ہے۔ تمثیل میں ہمیشہ وہی پہلو متعلق ہوتا ہے جو اصل صورتحال میں موجود ہوتا ہے نہ کہ تمثیل کے تمام پہلو۔ یہاں اصل میں چونکہ قرآن کی قرات سن کر اس سے کترا جانے، دور دور رہنے بلکہ الٹا پلٹ جانے کو بیان کرنا مقصود ہے اس لیے تمثیل میں شیر کے گدھے کو شکار کر لینے یا اس کا تعاقب کر لینے کا نہیں بلکہ دور ہی سے اس کی دھاڑ سن کر گدھوں کے بھاگ جانے اور اس

سمت پلٹ کر نہ جانے کا پہلو مراد لیا جائے گا۔ یہ گفتگو یہاں نہیں ہوسکتی کہ شیر کو سامنے دیکھ کر گدھے کو بھاگنے کا موقع کب ملے گا، یا شیر کی رفتار گدھے سے زیادہ ہوتی ہے۔ ادب کو منطق سے نہیں سمجھا جاتا۔ تمثیل میں یہی بات مراد لی جائے گی کہ گدھے دور سے بھی شیر کی آواز سن لیں تو کبھی اس سمت نہیں بڑھتے جہاں سے آواز آئی ہے بلکہ الٹا بھاگ نکلتے ہیں۔ امید ہے بات واضح ہوگئی ہوگی۔

اپنی حد سے بڑھ کر دعا مانگنا

سوال:

السّلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ !

سر! قرآن پاک کی سورۃ الاعراف کی آیت نمبر 55 کا ترجمہ پڑھتے ہوئے ایک سوال ذہن میں ابھرا ہے، آیت کا ترجمہ ہے کہ :

تم اپنے پرودگار سے گڑگڑا کر اور چپکے چپکے سے دعا کیا کرو۔ بلا شبہ اللہ حد سے گزرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔

اس کی تفسیر دیکھی تو لکھا تھا کہ حد کے اندر دعائیں مانگنے کا حکم ہے، اپنی حیثیت سے بڑھ کر مانگنا حد سے بڑھنا ہے۔ یہ حد کے اندر دعا سے کیا مراد ہے؟ یہ دعا مانگتے وقت کی کیفیت کا ذکر ہے یا الفاظ کا مطلب کہ جو دعا مانگی جا رہی ہے ہم اس کے قابل ہیں یا نہیں؟ یوں تو ہم گناہگار رب کریم سے جنت الفردوس کا سوال بھی کرتے ہیں جبکہ ہم اس کے قابل نہیں ہیں۔

والسلام۔ راحت عباس

جواب:

وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

جس آیت کے بارے میں یہ اشکال پیدا ہوا ہے اس کے اصل الفاظ یہ ہیں:

انه لا يحب المعتدين یعنی اللہ حد سے بڑھنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔

یہاں ''معتدین'' سے مراد وہ لوگ ہیں جو سرکشی اور تکبر کا شکار ہیں اور اس روش کی بنا پر بندگی کی حدود سے تجاوز کر جاتے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہوتے ہیں جو خدا سے مانگنے کے بجائے اپنے زورِ بازو اور علم وصلاحیت کو اپنی ہر نعمت کی بنیاد سمجھتے ہیں۔ اس کی ایک مثال قارون ہے جو اپنے مال ودولت کو اپنی صلاحیت کا نتیجہ سمجھتا تھا۔

اس وضاحت کی روشنی میں آیت کا مطلب یہ نہیں کہ اس خاص جملے میں دعا کی کیفیت یا حدود کا بیان ہے۔ دعا کی کیفیت تو پچھلے جملے میں بیان ہو چکی یہاں دعا کی حدود نہیں بلکہ بندے کی حدود بیان کی جا رہی ہیں کہ پروردگار ایک بلند وعظیم ہستی ہیں جو کائنات کے خالق و مالک ہیں جبکہ باقی سب مخلوق ہیں۔ تو انھی سے مانگنا چاہیے، بڑے عجز سے مانگنا چاہیے۔ کیونکہ وہ اکڑنے، سرکشی کرنے اور بندگی کی حدود سے تجاوز کرنے والوں کو پسند نہیں کرتے۔

باقی آپ کو اللہ سے جو مانگنا ہے وہ مانگیں جنت الفردوس مانگیں۔ بلاشبہ وہ مانگنے کی چیز ہے۔ دعا میں جس چیز کی ممانعت ہے وہ ظلم وزیادتی پر مبنی کسی چیز کا مانگنا ہے۔ کیونکہ یہ چیز اخلاقی طور پر سخت ناپسندیدہ ہے۔

اپنی اصلاح کا آغاز

سوال: السلام علیکم!

سر انسان کو اپنی اصلاح کا آغاز کس بنیادی نکتے سے کرنا چاہئیے؟ مطلب مثال کے طور پر

مجھ میں بہت ساری برائیاں ہیں اور میں اپنی اصلاح کی خواہاں ہوں تو سب سے پہلے کیا چیز ہونی چاہیئے جس پر فوکس ہو کر اس کو ٹھیک کرنے یا اس کو اپنے اندر پیدا کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔

جواب:

وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ و برکاتہ

اپنی اصلاح کے آغاز کا لائحہ عمل ہر شخص کے لیے کچھ مختلف ہوسکتا ہے۔ تاہم عمومی طور پر اس میں دو باتوں کو ملحوظ رکھنا چاہیے۔ جن برائیوں کا چھوڑنا آسان ہو پہلے ان سے شروع کرنا چاہیے۔ اس کے بعد ان برائیوں پر توجہ مرکوز کرنا چاہیے جن کو چھوڑنے میں دقت پیش آتی ہے۔

دوسری بات یہ کہ اس کے ساتھ اپنے علم کی سطح کو بڑھاتے رہنا چاہیے خاص کر وہ علم جس کا مقصد اصلاح و تربیت ہے۔ اس مقصد کے لیے آپ ہمارے تربیتی کورس جوائن کرسکتی ہیں۔ اس علم سے آپ کو معلوم ہوگا کہ کون سی غلطیاں اور برائیاں ہم میں موجود ہیں مگر ہم ان کو برا نہیں جانتے۔ انشاءاللہ اس طرح آپ کے اندر اصلاح اور بہتری کا ایک مسلسل عمل شروع ہو جائے گا۔

لایعنی بحثیں

سوال: السلام علیکم ورحمۃ اللہ و برکاتہ

کچھ لوگوں کا کہنا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس دنیا سے نہیں گئے۔ وہ آج بھی اس دنیا میں ہیں۔ اور اس بات کو ثابت کرنے کے لیے وہ کہتے ہیں کہ جب معراج کا واقعہ پیش آیا تھا اور جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم زمین سے آسمانوں کی طرف گئے تھے تو یہ کائنات اور اس کا نظام رک گیا تھا۔ اور جب واپس زمین پر آئے تھے تو سب کچھ وہیں سے شروع ہوا جہاں سے وہ چھوڑ کر گئے تھے۔ اور وہ کائنات آج بھی چل رہی ہے۔ کیوں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حاضر

ہیں اس دنیا میں۔اور وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو نور مانتے ہیں اللہ کا۔جب کہ قرآن میں ان کے بشر ہونے کی کئی آیات ہیں۔ان لوگوں کو کیسے قائل کیا جائے جو یہ سمجھتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم زندہ ہیں اور نور ہیں؟

جواب: وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

ایسے لوگوں کو قرآن مجید کے مطالعے کی طرف راغب کریں۔اگر بحث کریں گی تو تلخی پیدا ہوگی۔ایسی بحثوں نے ایک زمانے میں لوگوں میں بڑی نفرتیں پیدا کی ہیں۔ان سے بچنا چاہیے۔لوگوں پر واضح کرنا چاہیے کہ ہم سے اصل مطالبہ آپ کی اطاعت اور پیروی کا ہے۔اسی پر توجہ دینی چاہیے کیونکہ یہی وہ سوال ہے جو قیامت کے دن ہم سے کیا جائے گا۔نہ کہ آپ کے نور و بشر، حاضر و ناظر ہونے کے متعلق۔

جب کسی محرومی کا دکھ ستانے لگے
تو اپنی ان نعمتوں کو گنیے
جو اگر چھن گئیں تو
جینا مشکل ہوجائے گا

جو پڑھ نہیں سکتا اور جو پڑھتا نہیں ہے
دونوں یکساں طور پر جاہل رہتے ہیں (ماخوذ)

ابویحییٰ

مضامین قرآن (7)

وجود باری تعالیٰ کے دلائل

سابقہ گفتگو کا خلاصہ

ہم قرآن مجید میں بیان ہونے والے وجود باری تعالیٰ کے دلائل پر گفتگو کررہے ہیں۔ دور جدید میں چونکہ علمی سطح پر اللہ تعالیٰ کا انکار کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس لیے ہم بہت تفصیل میں جا کر قرآن مجید کے ان دلائل کا احاطہ کرنے کی کوشش کررہے ہیں جو اس بات کو بالکل متعین کردیتے ہیں کہ کس طرح عمل و عقل کی انسانی روایت خدا کو ماننے پر مجبور ہے۔ ہم نے اب تک دو بنیادی دلائل دیکھے ہیں۔ ان کا خلاصہ یہ ہے کہ انسان اس مادی کائنات میں حیوانی وجود لے کر پیدا ہوا ہے لیکن اس کے ساتھ وہ اپنے اندر ایک روحانی اور اخلاقی حس بھرپور طریقے سے محسوس کرتا ہے۔ یہ حس نہ صرف مادی حواس خمسہ سے بالکل جدا ہے بلکہ تقاضہ کرتی ہے کہ اس کا ماخذ خدا کی ہستی کو مانا جائے۔ دوسری دلیل یہ بتاتی ہے کہ انسان کو عقل و فہم کی جو استعداد دی گئی ہے وہ اس کائنات کا تجزیہ اور اپنے اندر سے اٹھنے والے جذبات و احساسات کا ادراک کرسکتی ہے۔ وہ جب یہ کرتی ہے تو کائنات میں موجود زندگی اور تخلیق کا سلسلہ، متضاد عناصر میں پایا جانے والا ربط و مقصدیت کا عنصر اور وجود انسانی کی اندرونی پکار یہ سب مل کر مطالبہ کرتے ہیں کہ حیات و کائنات کو ایک خالق، اس میں پائی جانے والی ربط و نظم کو ایک ناظم اور انسان کی جبین نیاز کو ایک معبود کی ضرورت ہے۔ اس خالق، ناظم اور معبود کا انکار کرکے انسان ساری زندگی بے مقصد اندھروں میں بھٹکنے کے سوا اور کچھ نہیں کرسکتا۔

تیسری دلیل: خدائے متکلم

اب تک کے دلائل سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اس کائنات کا ایک خالق ہے۔ انسان اس خالق کا بھرپور شعور رکھتا اور کائنات اس خالق و ناظم کا مکمل تعارف کراتی ہے۔ یہ حقیقت اتنی واضح ہے کہ انسان نے اوہام سے نکل کر فلسفہ و سائنس کی وادیوں میں قدم رکھا تو بہر حال ایک خالق کا انکار وہ نہیں کر سکے۔ مگر یہ خالق بہر حال ایک ایسی ہستی محسوس ہوتا ہے جس نے کائنات اور انسان کو بنا تو دیا، مگر اس کے بعد گویا وہ اس جہاز کو ایک آٹو پائلٹ کے حوالے کر کے غیر متعلق ہو چکا ہے۔ قوانین فطرت زلزلے اور سیلاب کی شکل انسانی آبادیوں کو نگل جائیں مگر وہ بے پروا، اس کے نام پر کھڑے لوگ اختلاف و عناد میں ہر حد عبور کر جائیں مگر وہ بے نیاز، ظلم و فساد دھرتی کے خشک و تر کو بھر دے مگر وہ بے حس و حرکت؛ ایسے خدا کو ماننا کسی معقول آدمی کے لیے بہت مشکل کام ہے۔ چاہے کائنات کچھ بھی کہے اور انسان کا اندرونی وجود کچھ بھی پکارے۔ عقل، علم، فہم، بصیرت، معرفت غرض سب کا تقاضہ ہے کہ اگر خدا ہے تو اپنے آپ کو ظاہر کرے۔ انسانی آنکھ اس کی براہ راست دید کا تقاضہ کرے تو اس کا غضب بجا لیکن سماعت کے دریچے اس کی صدا سنیں اور فہم کی آنکھ اس کا ادراک کرے، یہ مطالبہ کیسے غلط ہو سکتا ہے۔ سب سے نہ سہی وہ کچھ سے کلام کرے۔ سو اگر وہ ہے تو اسے سامنے آنا ہو گا۔ نہیں ہے تو کبھی سامنے نہیں آئے گا۔ پھر جو ہے وہ بس کہانیاں ہیں اور داستانیں ہیں اور کچھ نہیں۔

یہی وہ مقام ہے جہاں سے پیغمبر اٹھتے ہیں اور بتاتے ہیں کہ نہیں نہیں! ایسا نہیں ہے۔ باخدا ایسا نہیں ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ خدائے کائنات نے ان سے کلام کیا ہے۔ اپنی مرضی سے انھیں آگاہ کیا ہے۔ فطرت کی پکار کو انسانی الفاظ میں بیان کیا ہے۔ کائنات کے اسرار کو کھلے حقائق میں بیان کیا ہے۔ ظلم و فساد کی وجوہات کو کھولا ہے۔ مذہبی اختلاف میں اپنی ہدایات کو کھولا ہے۔ اس

کے آغاز و انجام کی حقیقتوں کو واضح کیا ہے۔ اس کے ماضی اور مستقبل کی سچائیوں کو واضح کیا ہے۔ وہ بول رہا ہے۔ اپنے وجود کو بول کر ثابت کررہا ہے۔ وہ اپنی بندگی کی طرف بلا رہا ہے تو اس کے ناقابل انکار دلائل دے رہا ہے۔ وہ رسولوں کو اٹھا رہا ہے تو ان کی سچائی کے یقینی دلائل پیش کررہا ہے۔ وہ اپنی مرضی بتا رہا ہے۔ اپنی مرضی پر چلنے کا انجام بتا رہا ہے۔ اپنی ناراضی کا نتیجہ بتا رہا ہے۔ یقین دلا رہا ہے کہ ایک روز تم اس کے حضور پیش ہوگے جہاں آج کے روحانی حقائق کل کے مادی حقائق میں بدل جائیں گے۔ آج کا ہر اخلاقی عمل کل جنت کے انعام اور آج کی ہر بداخلاقی کل جہنم کی آگ میں بدل جائے گی۔

اچھا! تمھیں یقین نہیں آتا۔ تم عقل وفطرت پر مبنی اور انفس و آفاق سے اٹھنے والے دلائل کو نہیں مانتے۔ چلو کچھ دیر رکو! ہم ان نتائج کو اسی دنیا میں برپا کرکے دکھاتے ہیں۔ پھر زیادہ دیر نہیں گزرتی کہ تنہا اٹھنے والے پیغمبر اور ان کے گنتی کے پیروکار زمین کے وارث بنادیے جاتے ہیں۔ اور وقت کے فرعونوں اور رسولوں کے منکرین کی جڑ کاٹ دی جاتی ہے۔ ایک معجزہ ہوجاتا ہے۔ ایک ناقابل یقین واقعہ پیش آجاتا ہے۔ مادی دنیا میں طاقت کا سارا زور رکھنے والے برباد ہوجاتے ہیں اور اخلاقی زندگی جینے والے ضعفاء بادشاہ بن جاتے ہیں۔ یہ واقعہ کچھ صدیوں کے بعد بار بار کیا جاتا رہا اور آخری دفعہ چودہ سو برس قبل اس واقعہ کو رونما کرکے اس کی پوری روداد قرآن مجید میں محفوظ کردی گئی۔ ابوجہل اور ابولہب جیسے قریش کے طاقتور سردار ساتھیوں سمیت ہلاک ہوگئے اور تنہا اٹھنے والے خدا کے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم عرب کے بادشاہ بن گئے۔ قیصرو کسریٰ کے تخت الٹ گئے اور نبی عربی کے غلام عرب وعجم کے مالک بن گئے۔

قرآن مجید درحقیقت ایسا ہی ایک صحیفہ رسالت ہے جس میں خدائے متکلم پورے طور پر زندہ وجاوید، فعال ومتحرک ہستی کے روپ میں نظر آتا ہے۔ وہ پیغمبر کو اٹھاتا ہے۔ کلام نازل کرتا ہے۔

لوگوں کو دعوت دیتا ہے۔دعوت کے دلائل بیان کرتا ہے۔ چلنے والوں کو راہ دکھاتا ہے۔ ماننے والوں کی رہنمائی کرتا ہے۔سوال کرنے والوں کے جواب دیتا ہے۔انکار کرنے والوں کو سمجھاتا ہے۔شک کرنے والوں کو یقین دلاتا ہے۔معترضین کو جواب دیتا ہے۔غافلوں کو متنبہ کرتا ہے۔ ظالموں کو جھنجھوڑتا ہے۔منافقین کو لتاڑتا ہے۔غداروں کو وعید کرتا ہے۔کافروں کو انذار کرتا ہے۔ مومنین کو بشارت دیتا ہے۔اورآخر کار اپنی مرضی کو نافذ کر کے دکھاتا ہے۔

قرآن مجید اول تا آخر اسی حقیقت کا بیان ہے۔اس کی دعوت، دعوت کے دلائل، دعوت کو ماننے اور اس کے انکار کے نتائج اور مطالبات کے ضمن میں اب آگے ہم جو کچھ بیان کریں گے، وہ اسی بات کی تفصیل ہے۔گویا کہ مضامین قرآن اپنی ذات میں اول تا آخر اس بات کا ثبوت ہیں کہ اس کائنات کا ایک رب ہے۔زندہ و جاوید رب جو دیکھتا ہی نہیں بولتا بھی ہے۔یہی بولنے والا رب، یہی خدائے متکلم اپنے وجود کا سب سے بڑا ثبوت ہے۔

جدید فلسفے کے بانی رینے ڈیکارٹ (1650-1596) کا ایک جملہ فلسفے اور دانش سے بہرہ مند ہر انسان کو زبانی یاد ہوتا ہے۔ یہ جملہ انسانی تاریخ کا مشہور ترین جملہ ہے جسے علم و دانش کی دنیا میں انسانی ہستی کا سب سے بڑا ثبوت مانا جاتا ہے۔

"I think, therefore I am"

خدا کے وجود کے دلائل کے خاتمے پر اوپر بیان کردہ گفتگو کی روشنی میں یہ فقیر، یہ بندہ عاجز چاہتا ہے کہ ہر پڑھنے والا اس جملے کو یاد رکھ لے جو خدا کی سچائی کا سب سے بڑا ثبوت ہے۔

"He Speaks, therefore He is"

[جاری ہے]

ابو یحییٰ

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زبور میں پیش گوئی

محترم قارئین! پچھلے ماہ زبور میں حضرت داوٗد کی اس پیش گوئی کے حوالے سے کچھ گزارشات پیش کرنا شروع کی تھیں جو انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حوالے سے کی تھی۔ یہی پیش گوئی تھی جس کی اہمیت کی بنا پر سیدنا مسیح نے اسے انجیل میں دہرایا تھا۔ اس پیش گوئی کے بیان سے قبل میں نے حضرت داوٗد کی زندگی کے کچھ حالات بیان کیے تھے۔ نیز یہ بھی بتایا تھا کہ کس طرح زبور کے ایک مزمور میں وہ حرم پاک کی یادوں کو تازہ کرتے اور مکہ کو بکہ کے اس نام سے یاد کرتے ہیں جس کا ذکر قرآن میں بھی آیا ہے۔

زبور میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی پیش گوئی

تاہم جس پیش گوئی کا میں نے ذکر کیا ہے وہ زبور کے ایک دوسرے مزمور (زبور:118) میں آئی ہے۔ جہاں تک میں سمجھا ہوں یہ مزمور عین حالت حج میں کہا گیا ہے۔ قارئین کی سہولت کے لیے اس مزمور کو پورا نقل کر رہا ہوں۔ کیونکہ اس سے نہ صرف پوری بات سمجھ میں آئے گی بلکہ یہ واضح کرنے میں بھی سہولت رہے گی کہ یہود و نصاریٰ اس پیش گوئی کا رخ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے موڑ کر کس طرح دوسروں کی طرف کر دیتے ہیں۔ پھر اس سے یہ فائدہ بھی ہے کہ یہ مزمور ریکارڈ پر آجائے گا کیوں کہ یہود و نصاریٰ کا دستور ہے کہ وہ جب یہ دیکھتے ہیں کہ کسی مسلمان نے ان کی کتاب سے نبی عربی کی صداقت کا کوئی ثبوت پیش کر دیا ہے تو وہ فوراً اس ترجمے کو متروک قرار دے کر ایک ایسا نیا ترجمہ کرتے ہیں جس میں اصل بات غائب کر دی جاتی ہے۔

یہ مزمور نقل کرنے سے قبل یہ بھی واضح کر دوں کہ دیگر الہامی کتب کی طرح زبور بھی ترجمہ در

ترجمہ کے عمل سے گزری ہے۔اس کے نتیجے میں اس میں اب وہ تاثیر محسوس نہیں ہوگی جو قرآن مجید نے بیان کی ہے کہ پہاڑ اور پرندے بھی حضرت داؤد کے ساتھ حمد و تسبیح کرتے تھے۔مگر بہرحال وہ معنویت موجود ہے جس کی بنا پر قرآن مجید نے بار باران کتابوں کا حوالہ دے کر یہ کہا تھا کہ ہمارے نبی کا تذکرہ تم ان کتابوں میں لکھا ہوا پاتے ہو، (اعراف 157:7)۔

حضرت داؤد کا مزمور

اس مزمور کے کئی حصے ہیں۔میں ذیل میں مزمور نقل کررہا ہوں اور ساتھ ساتھ اہم باتوں کی وضاحت بھی کرتا جاؤں گا۔

خداوند کا شکر کرو کیونکہ وہ بھلا ہے
اور اس کی شفقت ابدی ہے
اسرائیل اب کہے
اس کی شفقت ابدی ہے
ہارون کا گھرانہ اب کہے
اس کی شفقت ابدی ہے
خداوند سے ڈرنے والے اب کہیں
اس کی شفقت ابدی ہے

یہ ابتدائی آیات یعنی 1 تا4 اللہ کی حمد پر مشتمل ہیں۔جبکہ آخری آیت یعنی 29 میں بھی یہی حمد یہ مضمون دہرایا گیا ہے۔یہی حمد یہ انداز زبور کی وجہ شہرت بھی ہے۔پھر آیت 5 سے 18 تک وہ یہ بیان کرتے ہیں کہ کس طرح ان کے دشمنوں نے ان کو گھیر لیا تھا اور فلسطین کی تمام قومیں ان کے خلاف ہوگئی تھیں مگر انھوں نے اللہ سے مدد مانگی اور اسی پر بھروسہ رکھا تو اللہ نے انھیں ان

دشمنوں سے نجات عطا فرما دی۔ پھر وہ اپنے لیے اس مزمور میں ایک عظیم پیش گوئی کرتے ہیں کہ وہ اپنے تمام دشمنوں کو شکست دیں گے اور ان کو مارنے والوں کی تمام تر کوششوں کے برخلاف وہ زندہ رہیں گے اور اللہ کی حمد کرتے رہیں گے۔ کس طرح وہ ایک سخت آزمائش سے تو گزرے مگر آخر کار اللہ نے انھیں بچا لیا۔ فرماتے ہیں:

میں نے مصیبت میں خداوند سے دعا کی
خداوند نے مجھے جواب دیا اور کشادگی بخشی
خداوند میری طرف ہے میں ڈرنے کا نہیں
انسان میرا کیا کر سکتا ہے؟
خداوند میری طرف میرے مددگاروں میں ہے
اس لیے میں اپنے عداوت رکھنے والوں کو دیکھ لوں گا
خداوند پر توکل رکھنا
انسان پر بھروسا رکھنے سے بہتر ہے
خداوند پر توکل رکھنا
امراء پر بھروسا رکھنے سے بہتر ہے
سب قوموں نے مجھے گھیر لیا
میں خداوند کے نام سے ان کو کاٹ ڈالوں گا
انھوں نے مجھے گھیر لیا۔ بیشک گھیر لیا
میں خداوند کے نام سے ان کو کاٹ ڈالوں گا
انھوں نے شہد کی مکھیوں کی طرح مجھے گھیر لیا۔ وہ کانٹوں کی آگ کی طرح بجھ گئے

میں خداوند کے نام سے ان کو کاٹ ڈالوں گا
تو نے مجھے زور سے دھکیل دیا کہ گر پڑوں
لیکن خداوند نے میری مدد کی
خداوند میری قوت اور میرا گیت ہے
وہی میری نجات ہوا
صادقوں کے خیموں میں شادمانی اور نجات کی راگنی ہے
خداوند کا داہنا ہاتھ دلاوری کرتا ہے
خداوند کا داہنا ہاتھ بلند ہوا ہے
خداوند کا داہنا ہاتھ دلاوری کرتا ہے
میں مروں گا نہیں بلکہ جیتا رہوں گا
اور خداوند کے کاموں کو بیان کروں گا
خداوند نے مجھے سخت تنبیہ تو کی ہے
لیکن موت کے حوالہ نہیں کیا

آیت 19 سے وہ سلسلہ کلام ہے جس میں وہ حرم میں داخل ہوتے ہوئے وہ مشہور پیش گوئی کرتے ہیں جس کا شروع میں ذکر ہوا۔ انداز سے صاف ظاہر ہے کہ اس سے قبل کی آیات وہ راستے میں پڑھ رہے تھے، مگر اب وہ حرم میں داخل ہورہے ہیں اور حرم کو سامنے دیکھ کر اللہ تعالیٰ کو براہ راست مخاطب ہو کر گفتگو کر رہے ہیں۔ فرماتے ہیں:

صداقت کے پھاٹکوں کو میرے لیے کھول دو
میں ان سے داخل ہو کر خداوند کا شکر کروں گا

خداوند کا پھاٹک یہی ہے
صادق اس سے داخل ہوں گے
میں تیرا شکر کروں گا کیونکہ تو نے مجھے جواب دیا
اور خود میری نجات بنا ہے

اب اس کے بعد حرم کے سامنے کھڑے ہو کر حجر اسود کو دیکھ کر فرماتے ہیں۔ یہ وہی پیش گوئی ہے جس کا ذکر سیدنا مسیح نے کیا ہے۔

جس پتھر کو معماروں نے رد کیا
وہی کونے کے سرے کا پتھر ہو گیا
یہ خداوند کی طرف سے ہوا
اور ہماری نظر میں عجیب ہے
یہ وہی دن ہے جسے خداوند نے مقرر کیا
ہم اس میں شادمان ہوں گے اور خوشی منائیں گے
آہ! اے خداوند! بچا لے
آہ! اے خداوند! خوشحالی بخش

اس کے بعد سرکار دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم کی آمد کی پیش گوئی اس طرح کرتے ہیں:

مبارک ہے وہ جو خداوند کے نام سے آتا ہے
ہم نے تم کو خداوند کے گھر سے دعا دی ہے
یہوواہی خدا ہے اور اسی نے ہم کو نور بخشا ہے
قربانی کو مذبح کے سینگوں سے رسیوں سے باندھو

تو میرا خدا ہے۔ میں تیرا شکر کروں گا
تو میرا خدا ہے۔ میں تیری تمجید کروں گا
خداوند کا شکر کرو کیونکہ وہ بھلا ہے
اور اس کی شفقت ابدی ہے

اوپر لکھے ہوئے الفاظ پر پھر غور کیجیے۔

مبارک ہے وہ جو خداوند کے نام سے آتا ہے، (آیت 26)۔

ہر قرینہ اس بات کا گواہ ہے کہ آنے والی ہستی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ہستی ہے۔ اور یہ الفاظ حرم مکہ میں ادا کیے جا رہے ہیں۔ اس کا سب سے بنیادی قرینہ یہ ہے کہ حضرت داؤد کے زمانے میں ابھی ہیکل سلیمانی کی تعمیر نہیں ہوئی تھی۔ یہود کی کوئی مرکزی عبادت گاہ نہیں تھی۔ مگر دیکھیے کہ اس مزمور میں خداوند کا پھاٹک یہی ہے (آیت 20) اور ہم نے تم کو خداوند کے گھر سے دعا دی ہے، (آیت 26) کے الفاظ آتے ہیں۔ خداوند کا گھر دراصل بیت اللہ کا ترجمہ ہے۔ حضرت داؤد کے زمانے میں بیت اللہ کہلانے والی عمارت دنیا کے نقشے پر ایک ہی تھی اور وہ حرم کعبہ تھا۔ مزید اس مزمور میں وہ قربانی اور قربانی گاہ یعنی مذبح کا ذکر کرتے ہیں، (آیت 27)۔ کیا یہ بات مسلمانوں کو بتانے کی کوئی ضرورت ہے کہ حج کے موقع پر حرم مکہ میں قربان گاہ اور قربانی کا زیارت سے کیا تعلق ہوتا ہے؟

پھر جو پیش گوئی کونے کے پتھر کے تعلق سے بیان ہوئی ہے وہ واضح رہے کہ بنی اسماعیل کے حوالے سے ہے کہ آج اس قوم کو دنیا نے فراموش اور رد کر رکھا ہے مگر کل یہ حرم پاک کے کونے کے پتھر یعنی حجر اسود کی طرح مقدس اور محترم ہو جائے گی۔ ہمیں یہ بات آج عجیب لگتی ہے، مگر یہ اللہ کا فیصلہ ہے۔ چنانچہ اس کے بعد وہ بنی اسماعیل کو عافیت اور خوشحالی کی دعا دیتے ہیں اور کہتے

ہیں کہ ہم نے تم کو خداوند کے گھر سے دعا دی ہے۔

تحریف وتاویل

یہود و نصاریٰ نے بڑی کوششیں کی ہیں کسی طرح اس پیش گوئی کا مصداق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نہ قرار پائیں۔ چنانچہ یہود نے اس معاملے میں یہ کام کیا کہ اس مزمور پر سے حضرت داؤد کا نام ہٹا دیا (خیال رہے کہ موجودہ زبور میں بعض مزامیر بعد میں آنے والوں کے بھی ہیں)۔ غالبًا ان کا خیال تھا کہ نہ رہے گا بانس اور نہ بجے گی بانسری کے بمصداق جب حضرت داؤد کی نسبت ہی نہیں رہی تو یہ پیش گوئی اپنی اہمیت کھو بیٹھے گی۔ مگر اس پیش گوئی کو حضرت عیسیٰ نے انجیل میں دہرا کر اس کی اہمیت کو اتنا نمایاں کر دیا کہ ایسی کوئی کوشش اب موثر نہیں ہوسکتی۔

ایک دوسری تاویل یہ کی جاتی ہے کہ یہ حضرت داؤد کا کلام اس لیے نہیں ہوسکتا کہ اس میں بیت اللہ یا خداوند کے گھر اور قربانی اور قربان گاہ کا ذکر آیا ہے۔ جیسا کہ پیچھے بیان ہوا کہ ہیکل سلیمانی تو حضرت داؤد کے بعد حضرت سلیمان نے بنوایا تھا۔ چنانچہ ان لوگوں کے نزدیک یہ بات بالکل واضح ہے کہ ''خداوند کے گھر'' جیسے کسی الفاظ کا کوئی مسمیٰ حضرت داؤد کے زمانے میں موجود ہی نہیں تھا، اس نے ان آیات کی یہ تاویل کرنے کی کوشش کی ہے کہ یہ مزمور حضرت داؤد کا ہے ہی نہیں بلکہ اس زمانے کا ہے جب یہود بابل کی اسیری سے واپس یروشلم لوٹ رہے تھے۔ یعنی بخت نصر یروشلم کو تباہ کر کے انھیں ساتھ بابل لے گیا تھا تو کم وبیش ایک صدی کی غلامی کے بعد سائرس یا ذولقرنین نے انھیں اس غلامی سے نجات دلا کر دوبارہ یروشلم لوٹنے کی اجازت دی تھی۔ ایسے میں کسی نامعلوم شخص نے یروشلم میں داخل ہوتے وقت ہیکل سلیمانی کو دیکھ کر یہ مزمور پڑھا تھا۔

تاہم اس مزمور کا ابتدائی حصہ اس تاویل کی مکمل طور پر نفی کر دیتا ہے۔ جیسا کہ ہم نے پیچھے

بیان کیا کہ حضرت داؤد بادشاہ وقت کے مسلسل عتاب کا نشانہ بنے رہے اور مستقلاً اپنی جان بچانے کی جدو جہد کرتے رہے اور آخر کار اپنے تمام دشمنوں پر اللہ کی مدد سے غالب آئے۔ اس کی پوری داستان بائبل میں موجود ہے۔ اس مزمور میں یہی داستان بہت اختصار سے بیان ہوئی ہے۔ اس داستان کا بابل سے لوٹنے والے لوگوں سے بالکل کوئی تعلق نہیں۔ وہ تو خود مغلوب ہو کر عراقیوں کی قید میں تھے جبکہ یہاں داؤد علیہ السلام یہ کھلی ہوئی پیش گوئی کر رہے ہیں:

''سب قوموں نے مجھے گھیر لیا۔ میں خداوند کے نام سے ان کو کاٹ ڈالوں گا۔ انہوں نے مجھے گھیر لیا۔ بیشک گھیر لیا۔ میں خداوند کے نام سے ان کو کاٹ ڈالوں گا۔ انہوں نے شہد کی مکھیوں کی طرح مجھے گھیر لیا۔ وہ کانٹوں کی آگ کی طرح بجھ گئے۔ میں خداوند کے نام سے ان کو کاٹ ڈالوں گا۔''، (آیت 10-12)

یہ دشمنوں میں گھرے ہوئے شخص کی للکار ہے کہ آج میں بہت مشکل میں ہوں لیکن کل میں کس طرح ان دشمنوں کا صفایا کر دوں گا۔ بنی اسرائیل کی پوری تاریخ میں کوئی دوسری شخصیت نہیں ہے جس کے خلاف اس طرح ساری قومیں اور قبائل اٹھ کھڑے ہوئے ہوں اور وہ تنہا اللہ کی مدد سے غالب آ گیا ہو۔ اس لیے یہ مزمور پڑھنے والی شخصیت سوائے حضرت داؤد کے اور کوئی ہو ہی نہیں سکتی۔

مسیحی حضرات کی تاویل

مسیحی حضرات اس کی وہی تاویل کرتے ہیں جو آسمانی صحائف میں موجود نبی کریم اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دیگر پیش گوئیوں کی کرتے ہیں۔ یعنی ان کا مصداق حضرت عیسیٰ ہیں، نہ کہ نبی آخر الزماں۔ لیکن اول تو یہی بات کہ یہ پیش گوئی حرم مکہ میں کی گئی ہے اس بات کی کوئی گنجائش نہیں چھوڑتی کہ جس آنے والے کا ذکر ہے وہ نبی عربی کے علاوہ کوئی اور ہو۔ مگر اس سے زیادہ اہم

بات یہ ہے کہ انجیل میں اس پیش گوئی کو نقل کرنے کے بعد اس کی جو شرح خود مسیح نے کی ہے اس کے مطابق ان کی اپنی زندگی اور ان کی قوم کسی طور پر اس پیش گوئی کا مصداق نہیں بن سکتیں۔ مسیحی حضرات کہتے ہیں کہ اس پیش گوئی کا مصداق مسیح ہیں۔ جبکہ اکا دکا وہ مسلمان اہل علم جنھوں نے اس پیش گوئی کو موضوع بنایا ہے یہ کہتے ہیں کہ اس سے مراد ہمارے نبی ہیں۔ میں یہ نقطہ نظر پیش کر رہا ہوں کہ ''کونے کے پتھر'' کا مصداق کوئی فرد نہیں بلکہ قوم ہے۔ یہی بات حضرت داؤد نے زبور میں بیان کی تھی اور یہی چیز انجیل میں سیدنا مسیح نے بالکل کھول کر رکھ دی ہے۔ تاہم اس کے لیے انجیل کے بیان کو سمجھنا ہوگا۔

انجیل کی کتاب متی باب 21 کی آیت 23 سے یہ واقعہ بیان ہونا شروع ہوتا ہے کہ حضرت عیسیٰ ہیکل سلیمانی میں کھڑے ہو کر دعوت دے رہے تھے کہ یہود سردار اور کاہن ان کے ارد گرد جمع ہو گئے اور ان پر اعتراض کرنے لگے کہ تم یہ کام کس اختیار کے تحت کر رہے ہو۔ اس پر حضرت عیسیٰ نے پہلے ان کے کفر پر ان کو تنبیہ کی اور پھر ایک تمثیل کی زبان میں انھیں بتایا کہ اللہ کا عذاب ان پر آیا چاہتا ہے اور اب انھیں فارغ کر کے ایک دوسری قوم کو یہ منصب دے دیا جائے گا۔ اس کے بعد انھوں نے حضرت داؤد کی زیر بحث پیش گوئی بیان کی اور ساتھ میں خود اس کی شرح اس طرح کرتے ہوئے فرمایا:

اس لیے میں تم سے کہتا ہوں کہ خدا کی بادشاہی تم سے لے لی جائے گی اور اس قوم کو جو اس کے پھل لائے دے دی جائے گی۔ اور جو اس پتھر پر گرے گا ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے گا لیکن جس پر وہ گرے گا اسے پیس ڈالے گا۔ اور جب سردار کاہنوں اور فریسیوں نے اس کی تمثیلیں سنیں تو سمجھ گئے کہ ہمارے حق میں کہتا ہے۔ اور وہ اسے پکڑنے کی کوشش میں تھے لیکن لوگوں سے ڈرتے تھے کیونکہ وہ اسے نبی جانتے تھے، (متی 21:43-46)۔

حضرت عیسیٰ نے صاف واضح کر دیا ہے کہ یہاں زیر بحث قوم ہے کوئی فرد نہیں۔ یعنی بنی اسرائیل کو اللہ کا عذاب دے کر جب منصب امامت سے فارغ کر دیا جائے گا تو وہ پتھر یعنی بنی اسماعیل جنھیں یہود بے وقعت سمجھتے تھے، کونے کے سرے کا پتھر ہو جائے گا۔ اب اگر یہ بات ذہن میں رہے کہ پیش گوئی کرنے والے نبی داؤد اگر حرم میں کھڑے ہوئے ہیں تو کونے کا پتھر کیا ہو سکتا ہے۔ یہ بلاشبہ حجر اسود کی طرف اشارہ ہے جو حرم کی عمارت کا اہم ترین حصہ ہے۔ مطلب یہ ہے کہ بنی اسماعیل کی قوم جو سب سے غیر اہم تھی وہ عنقریب دنیا میں سب سے زیادہ اہم ہو جائے گی۔ اور پھر مسیح اس کی شرح کرتے ہیں کہ اس قوم کو وہ غلبہ وقوت اور اقتدار ملے گا کہ یہ دنیا کی جس قوم سے ٹکرائے گی اسے پاش پاش کر ڈالے گی۔

کون نہیں جانتا کہ داؤد اور مسیح علیہما السلام کی یہ پیش گوئیاں کس طرح حرف بحرف درست ثابت ہوئی ہیں۔ وہ عرب جنھیں یہود حقارت سے اُمی کہتے تھے اور ساری دنیا جنھیں غیر متمدن سمجھتی تھی جب ایمان لے آئے تو کس طرح بقول حضرت داؤد کے عجیب طریقے پر دنیا کی سپر پاورز کے پرخچے اڑا دیے اور جو قوم ان سے ٹکرائی ریزہ ریزہ ہو کر بکھر گئی۔ اس کے برعکس حضرت عیسیٰ کے اپنے پیروکاروں کا معاملہ یہ تھا کہ ابتدائی کئی صدیوں میں ان کے پیروکاروں پر بدترین ظلم وستم ہوتے رہے۔ وہ کسی قوم کو کیا پیستے، دوسری قومیں انھیں پیستی رہیں۔ چنانچہ حضرت عیسیٰ یا ان کی قوم سرے سے اس پیش گوئی کا مصداق ہو ہی نہیں سکتے۔ مسیحی حضرات لاکھ زور لگا لیں، خود سیدنا مسیح اس پیش گوئی کی جو شرح کر کے گئے ہیں وہ ان کی راہ کی سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔ بلاشبہ اس پیش گوئی کا مصداق اگر کوئی ہے تو سرکار دو عالم کی ہستی ہے اور آپ کی قوم یعنی صحابہ کرام ہیں۔ اللہ ان پر اپنی رحمتیں اور برکتیں نازل کرے اور ہمیں ان کے نقش قدم پر چلائے۔ آمین۔

پروفیسر محمد عقیل

اعتقاد کی سند

میں چند دن قبل اپنے دوست سے ملنے گیا۔ کافی دنوں بعد ملاقات ہوئی تھی۔ اس نے بتایا کہ اس کے پتے میں کافی عرصے سے درد ہے۔ اور وہ ایک دن پتے کا آپریشن کرانے کے لئے ہسپتال میں بھی ایڈمٹ ہو گیا تھا کہ کسی صاحب نے کہا کہ کلونجی ہر مرض کی دوا ہے اور یہ بات قرآن و حدیث میں بھی بیان ہوئی ہے۔ چنانچہ اللہ کا کلام کبھی جھوٹا نہیں ہو سکتا۔ بس تم صبح سے سات دانے کلونجی کے کھانا شروع کر دو۔ میرے دوست نے ہسپتال سے کوچ کیا اور کلونجی کے دانے کھانا شروع کر دیئے۔

میں نے اس سے پوچھا:

" کیا تم نے ٹیسٹ کروایا کہ پتے میں پتھری ہے یا نکل گئی؟"۔

اس نے کہا " : دیکھو بھئی مجھے اللہ پر یقین ہے کہ اب وہ پتھری نہیں ہوگی اور اعتقاد کا تقاضا ہے کہ میں ٹیسٹ نہ کراؤں ورنہ تو اعتقاد اور توکل کس بات کا؟

میں نے اس سے پوچھا: ''کیا تم نے کبھی یہ جاننے کی کوشش کی کہ تمہارا اعتقاد درست بھی ہے یا نہیں؟''

اس نے نفی میں جواب دیا۔ میں نے پھر پوچھا: ''اچھا یہ بتاؤ کلونجی میں شفا ہے۔ یہ بات قرآن میں کہاں لکھی ہے؟''

وہ آئیں بائیں شائیں کرنے لگا۔ کہنے لگا اچھا حدیث میں بیان ہوئی ہوگی۔ میں نے اسے بتایا کہ ایسی کوئی بات کسی صحیح حدیث میں میرے علم کے مطابق بیان نہیں ہوئی ہے کہ کلونجی پتے کی پتھری کا علاج ہے۔ کلونجی کے بارے میں جو حدیث بیان ہوئی ہے وہ یہ ہے:

''حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کوئی بیماری ایسی نہیں سوائے موت کے جس کی شفاء کلونجی میں نہ ہو۔'' (صحیح مسلم: جلد سوم: حدیث

نمبر 1271)

یہ سن کر وہ کہنے لگا ": دیکھو اس میں واضح طور پر لکھا ہے کہ کلونجی میں ہر مرض کی دوا ہے سوائے موت کے۔ تو تم کس طرح کہہ سکتے ہو کہ یہ پتے کی پتھری کا علاج نہیں ہے؟

میں نے کہا: ''اچھا چند احادیث سنو''

حضرت بریدہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کھنبی آنکھوں کے لئے علاج ہے عجوہ جنت کا میوہ ہے اور یہ کلونجی جو نمک میں ہو موت کے علاوہ ہر بیماری کا علاج ہے۔ (مسند احمد: جلد نہم: حدیث نمبر 2934)

ایک اور حدیث ہے:

عامر بن سعد اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو آدمی ہر صبح کو سات عجوہ کھجوریں کھالے تو اس دن کوئی زہر اور جادو اس کو نقصان نہیں پہنچا سکتا۔ (صحیح بخاری: جلد سوم: حدیث نمبر 424)

''اگر کلونجی عمومی طور پر ہر مرض کی دوا ہوتی تو نبی کریم کھنبی کو آنکھوں کے علاج کے لئے کیوں تجویز کرتے اور عجوہ کو زہر اور جادو کے لئے کیوں تریاق قرار دیتے۔''

''لیکن اس حدیث میں تو کہا گیا ہے کہ کلونجی ہر مرض کی دوا ہے سوائے موت کے۔'' اس نے پھر استفسار کیا

میں نے اسے سمجھایا:

" دیکھو بعض اوقات حدیث میں ایک بات مختصر بیان ہوتی ہے اور اس سے پہلے یا بعد میں کیا بات تھی وہ اکثر بیان کرنے والا نہیں بیان کرتا۔ جس کی بنا پر غلط فہمی پیدا ہو جاتی ہے۔ درج ذیل حدیث تمہاری اس بات کا جواب ہے کہ کلونجی ہر مرض کی دوا ہے:

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کرتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے

فرمایا کہ شفا تین چیزوں میں ہے پچھنے لگوانا، شہد پینا یا آگ سے داغ لگوانا، اور اپنی امت کو داغ لگوانے سے منع کرتا ہوں۔(صحیح بخاری: جلدسوم: حدیث نمبر 659)

یہاں دیکھو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ شفا اگر ہے تو تین چیزوں میں اور یہاں کلونجی کا ذکر نہیں کیا۔"

"پھر یہ کیوں فرمایا کہ کلونجی موت کے علاوہ ہر مرض کی دوا ہے؟'' اس نے دوبارہ اپنی الجھن کا اظہار کیا۔

میں نے اس کی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

"نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بات اگر ان سے درست نسبت رکھتی ہے تو وہ کبھی غلط نہیں ہوسکتی۔ البتہ آپ کی بات کا درست مطلب سمجھنے کی ضرورت ہے۔ کلونجی کو ہر مرض کی دوا سمجھ لیا جائے تو اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ تمام ہارٹ کے آپریشن کینسل کر دیئے جائیں، تمام کینسر کے مریضوں کی کیموتھیراپی معطل کر دی جائے، تمام بخاروں میں اینٹی بائیوٹک بند کر دی جائے اور صرف کلونجی پر انحصار کیا جائے۔ ایسا تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے خود بھی نہیں کیا بلکہ کھمبی، شہد، عجوہ وغیرہ کو استعمال کیا ہے۔ اس حدیث کا درست مفہوم یہ ہے کہ کلونجی میں اس بات کی صلاحیت ہے کہ اسے تمام امراض کی شفا کے لئے استعمال کیا جاسکتا ہے لیکن یہ ایک ریسرچ کا ٹاپک ہے کہ کس طرح استعمال کیا جائے۔ اسی مفہوم میں ماضی کے علماء بھی اس حدیث کو لیتے رہے ہیں جیسا کہ مشکوٰۃ میں ذکر ہے:

''طیبی کہتے ہیں کہ اگرچہ حدیث کے مفہوم میں عمومیت ہے کہ کلونجی کو ہر بیماری کی دوا فرمایا گیا لیکن یہ کلونجی خاص طور پر انہی امراض میں فائدہ مند ہے۔ جو رطوبت اور بلغم میں پیدا ہوتے ہیں کیونکہ کلونجی خشک و گرم ہوتی ہے اس لئے یہ ان امراض کو دفع کرتی ہے جو اس کی ضد ہیں، بعض حضرات یہ کہتے ہیں کہ حدیث کا مفہوم عمومیت پر ہی معمول ہے یعنی کلونجی ہر بیماری میں فائدہ مند ہے اس طرح کہ اگر اس کو کسی بھی دوا میں خاص مقدار و ترکیب کے ساتھ شامل کیا جائے تو اس کے صحت بخش اثرات

ظاہر ہو سکتے ہیں"۔(مشکوٰۃ،طب کا بیان)

یہ سن کر اس کے چہرے پر تشویش کے آثار نمایاں ہونے لگے۔ میں نے کہا: ''دیکھو اللہ پر اعتقاد اور توکل کرنا ایک بہت اچھی بات ہے لیکن یہ بھی دیکھ لینا چاہئے کہ اس اعتقاد کی سند کیا واقعی اللہ یا اس کے رسول تک پہنچتی ہے یا نہیں۔ اب تم نے ایک مفروضے کو سچ سمجھ کر اس پر عمل کرنا شروع کر دیا اور اس کے مقابلے میں ایک مسلمہ علم یعنی میڈیکل سائینس کو سائیڈ میں کر دیا۔ یہ کوئی مناسب طرز عمل نہیں بلکہ اپنی جان کو ہلاک کرنے کے زمرے میں آتا ہے۔ میڈیکل سائنس بھی اللہ ہی کی جانب سے عطا کردہ ایک علم ہے اور اس سے روگردانی کرنا درحقیقت اللہ کی ایک نعمت کو ٹھکرانے کے مترادف ہے۔''

وہ میری اس تقریر پر چپ ہو گیا اور لگتا تھا شاید وہ میری بات سمجھ گیا ہے۔

ہمارے معاشرے میں اس قسم کی باتیں بہت عام ہیں کہ فلاں چیز کھانے سے ایسا ہو جائے گا۔ اگر کوئی یہ بات کسی علم، تجربے یا مشاہدے کی بنیاد پر مانتا ہے تو اسے ایسا کرنے کا حق ہے۔ لیکن جب اس قسم کی بات اللہ یا اس کے رسول کی نسبت سے بیان کی جاتی ہے تو پھر معاملہ مختلف ہو جاتا ہے۔ اگر ایسا واقعی قرآن یا صحیح حدیث میں بیان ہوا ہے تو بات قابل غور ہے لیکن اگر ایسا نہیں تو یہ اللہ اور اس کے رسول پر جھوٹ باندھنے کے مترادف ہے۔ اس کے علاوہ جب اس قسم کی چیزوں کو استعمال کرنے سے کوئی شفا نہیں ملتی تو لوگوں کا اللہ اور رسول پر سے اصل اعتقاد بھی متزلزل ہوتا ہے اور وہ دین سے بھی دور ہو جاتے ہیں۔

چنانچہ جب بھی کوئی اس طرح کی بات سامنے آئے کہ فلاں سورت اتنی مرتبہ پڑھنے سے گردے کی پتھری نکل جاتی ہے یا فلاں آیت کا ورد کینسر کے لئے شافع ہے اور وہ اسے اللہ کی جانب منسوب بھی کرے تو ہمارا فرض ہے کہ ہم اس بات کی صحت چیک کریں۔ بصورت دیگر ہم اپنا بھی نقصان کریں گے اور لوگوں کا بھی۔ اور یہ نقصان دنیا تک محدود نہیں رہے گا بلکہ اس کے اثرات آخرت تک جا پہنچیں گے۔

فرح رضوان

گمنام سپاہی

صدقہ اعلانیہ بھی دیا جاسکتا ہے لیکن اکثر لوگ واقعی اس طرح دیتے ہیں کہ دائیں ہاتھ سے دیں تو بائیں کو خبر نہیں ہوتی، اور ہمیں بھی ان صاحبہ کے منفرد صدقے کی کانوں کان خبر نہ ہو پاتی اگر ان کی ایک ساتھی اس راز سے پردہ نہ اٹھاتیں۔ اللہ تعالیٰ ان خاتون کی کوششوں کو قبول فرمائے اور ہمیں بھی مستقل مزاجی اور اخلاص کے ساتھ خلق میں خیر بانٹنے کی توفیق عطا فرمائے۔ (آمین)

آپ فاطمید فاونڈیشن کے نام اور کام سے تو واقف ہی ہونگے، ماشا اللہ یہ ادارہ پاکستان میں خون کے عطیات اکھٹا کرنے سے لیکر ضرورت مندوں تک پہنچانے تک کا کام بخوبی انجام دے رہا ہے اور سینکڑوں غریبوں کی دعائیں اس کے ساتھ ہیں۔ سوال یہ ہے کہ ان خاتون کا اس ادارے سے کیا تعلق ہے؟ کیا یہ اس کی مالی معاونت کرتی ہیں؟ جی نہیں، یہ کوئی امیر اسامی نہیں۔ تو کیا یہ یہاں ڈاکٹر ہیں؟ جی نہیں، یہ اتنی زیادہ پڑھی لکھی نہیں ہیں۔ تو کیا یہ اس ادارے میں کسی بھی اور طرح کی نوکری یا خدمت انجام دیتی ہیں؟ جی نہیں، اس ادارے سے براہ راست ان کا کوئی تعلق نہیں۔ تو پھر یہ یقیناً بلڈ ڈونر ہونگی؟ جی نہیں، ایسی قابل رشک صحت بھی نہیں ہے ان کی، لیکن ان کا ایمان ماشا اللہ بہت توانا ہے، اور ایک طرح سے یہ صحیح معنوں میں پڑوسی کے حقوق ادا کر رہی ہیں۔

یہ صاحبہ حیدر آباد میں قائم فاطمید کی شاخ کے نزدیک رہائش پذیر ہیں، اور انہوں نے اپنے انتہائی محدود وسائل کو بروئے کار لاتے ہوئے اپنے صحن میں ایک پبلک کچن بنایا ہوا ہے اور ضرورت کی تمام اشیاء وہاں پر مہیا کرتی ہیں، اندرون سندھ کے غریب ہاری مزدور طبقے کے افراد کے لیے تو اپنے مریض کے ساتھ سواری کا کرایہ ادا کرنا ہی دشوار ہوتا ہے، اس پر ستم یہ کہ غریب

شہر میں بیچارہ کھائے کیا؟ اور کہاں سے؟ تو اللہ تعالیٰ نے ان خاتون کے دل میں ایسے لوگوں کا خیال ڈال دیا، اب نہ ہی ان کو نت نئے ملبوسات میں کشش محسوس ہوتی ہے، نہ ہی گھر کی سجاوٹ کی بے جان اشیا سے ان کو کوئی لگاؤ رہ گیا ہے، شادی بیاہ پر بھی نمود و نمائش سے بچتی ہیں اور کیونکہ اپنے پوشیدہ صدقے کو سب سے چھپا کر رکھتی ہیں، لہٰذا اپنے سادہ رہنے پر لوگوں کی باتیں بھی خوب سنتی ہیں۔ لیکن ان کا دل اصل میں کتنا کھلا ہے یہ دور دراز سے علاج کی غرض سے آنے والے خوب جانتے ہیں، ان کے گھر کا کچن ہر وقت ان کے لیے کھلا ہوتا ہے خواہ وہ گھر پر ہوں یا نہ ہوں۔ لیکن! یہ جاتی کہاں ہیں؟ شاپنگ پر؟ نہیں، ابھی تو بتایا ہے ناں کہ اب مصنوعی زندگی سے ان کو لگاؤ نہیں رہا۔ تو socializing؟ نہیں اس کے تقاضے پورے کرنا اب ان کے بس میں نہیں رہا، تو سیر یا واک؟ کسی حد تک کہہ سکتے ہیں لیکن ان کی واک محض ہوا خوری پر مبنی نہیں ہوتی، اور ہر اس شخص کو جسے واقعی زندگی میں اچھے اعمال ذخیرہ کرنے کی عادت ہو جائے اس کا کوئی کام بھی پھر بے مقصد نہیں رہ جاتا۔

ویسے تو کسی کی ٹوہ لینا بہت بری بات ہے لیکن اس وقت ان کے ساتھ چل کر دیکھتے ہیں کہ ان کی واک کہاں جا کر رکتی ہے، یہ کیا! ان کا رخ تو اچانک سے کچے گھروں کی طرف ہو گیا ہے، اوں ہوں جگہ جگہ کچرا، گندی بدبو .... اور کتنی دیر یہ سب جھیلنا ہوگا؟ بس بس وہ دیکھیں یہ ایک جھگی نما گھر میں داخل ہو رہی ہیں، اور یہ کیا! یہ اندر سے اتنی اونچی آواز میں کون گلا پھاڑ چلا رہا ہے؟ یہ شخص جوان پر چیخ رہا ہے یہ نامراد اس گھر میں رہنے والے معذور اور بوڑھے لاچار والدین کا ہٹا کٹا بیٹا ہے، خود تو اپنے والدین کی خدمت سے محروم ہے ہی لیکن جب یہ محترم خاتون یہاں آ کر ان بوڑھے افراد کے کپڑے، بستر وغیرہ صاف کرتی ہیں، یہ یوں ہی چلاتا ہے اور یہ خاموشی سے اپنا کام کر کے چلی آتی ہیں۔

آپ بھی حیران ہیں ناں کہ کیا واقعی ایسے لوگ بھی ہوتے ہیں! سبقت لے جانے والے، بازی مار لینے والے، اپنے محاذ پر ڈٹے رہنے والے اور دوسرے کو یہ سوچنے پر مجبور کر دینے والے کہ یا اللہ انہوں نے تو جنت کا سودا کرلیا اور سالوں سے اسی ایک کام میں مستقل مزاجی سے لگی ہوئی ہیں اور ہم سالوں سے صرف تمنا تک ہی محدود ہیں کسی بڑی نیکی کی opportunity کسی مہورت کے منتظر، آج فرشتے ہمیں لینے آ گئے تو ہم ساتھ کیا لے جا سکیں گے؟

سلام ہے ان خاتون کے جذبے کو

یہ ہیں ہمارے ملک کے گمنام سپاہی جنہیں معلوم ہے کہ وہ اس راہ میں مارے گئے تو نہ ستارہ جرأت ملے گا نہ ستارہ امتیاز، نہ نشان حیدر نہ ہی توپوں کی سلامی دی جائے گی، لیکن جس ذات پاک کے لیے اخلاص سے یہ خدمت جاری ہے وہاں کیا استقبال ہوگا کیسی تکریم ہوگی کیسا اعزاز ان کا منتظر ہوگا، سبحان اللہ۔

جنت کا حقیقی مستحق وہ ہے جو
قربانی کے درجے میں اس کا طلبگار بنے
آج کا مسلمان تو
خواہش کے درجے میں بھی اس کا طلبگار نہیں
(ابو یحییٰ)

مبشر نذیر

ترکی کا سفر نامہ (11)

اگر بے حیائی اور سود موجودہ دور کے فتنے ہیں تو مذہبی جبر، آمرانہ اقتدار اور جاگیرداری نظام قدیم دور کے فتنے رہے ہیں۔

میری سمجھ میں یہ آیا کہ قدیم دور میں اہل مذہب کو جو اقتدار حاصل تھا، وہ دور جدید نے ان سے چھین لیا ہے۔ ہمارے اہل مذہب اپنی کتابوں میں ایک طرف یہ پڑھتے ہیں کہ بادشاہ، اہل علم کی پالکی کو کندھا دیا کرتے تھے اور شہزادے ان کی جوتیاں سیدھی کیا کرتے تھے۔ دوسری طرف وہ یہ دیکھتے ہیں کہ جدید معاشرے میں ان کی کوئی حیثیت نہیں ہے تو وہ اس دور میں خود کو ان فٹ محسوس کرتے ہیں۔ چونکہ ہمارے ہاں اہل مذہب کی اکثریت دین اسلام کو اس کے اصلی ماخذوں سے نہیں بلکہ قرون وسطی کے مخصوص تنگ نظر ماحول میں لکھی گئی کتابوں کے توسط سے سمجھتی ہے، اس وجہ سے انہیں یہ محسوس ہوتا ہے کہ دور جدید میں کوئی ایسا حادثہ پیش آیا ہے جس نے انسان کو اس کی اصل راہ سے بھٹکا دیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ جدید دور کی ہر اچھی چیز سے بھی نفرت کرتے دکھائی دیتے ہیں۔

اگر ہم دین اسلام کے اصل ماخذوں یعنی قرآن مجید اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سنت طیبہ کا جائزہ لیں تو معلوم ہوتا ہے کہ دور جدید نے قدیم دور کی بہت بڑی بڑی برائیوں جیسے مذہبی جبر اور نفسیاتی غلامی کا خاتمہ کر دیا ہے۔ قرون وسطی کے انسان کو اس بات پر مجبور کیا جاتا تھا کہ وہ ریاست کے مذہب کو قبول کرے۔ ریاست کے مذہب یا فرقے سے ذرا سا اختلاف کرنے پر انسان کو زنجیروں میں قید رکھا جاتا تھا، اس کی پیٹھ پر کوڑے برسائے جاتے تھے، اسے زندہ آگ میں جلا دیا جاتا تھا۔ الحمد للہ موجودہ دور میں یہ فتنہ بڑی حد تک ختم ہو چکا ہے۔ قرون

وسطی میں مذہبی راہنما طرح طرح کے ہتھکنڈوں سے انسانوں کو اپنا نفسیاتی غلام بنالیا کرتے تھے۔انفارمیشن ایج کے اس دور میں ان کے لئے ایسا کرنا کافی مشکل ہو گیا ہے۔

موجودہ دور میں بہت سے دانشور عیسائیت کی طرح اسلام کی اصلاح (Reformation) کرنے کی ضرورت کو بیان کرتے ہیں تا کہ اسے دورجدید کے ساتھ ہم آہنگ کیا جا سکے۔حقیقت یہ ہے کہ اسلام کی کسی اصلاح یا ریفارمیشن کی ضرورت نہیں ہے۔دور جدید درجہ بدرجہ ترقی کرتا ہوا خود ہی اسلام سے ہم آہنگ ہوتا چلا جا رہا ہے۔ریفارمیشن کی اصل ضرورت ہمارے مذہبی تصورات میں ہے جنہیں غلط طور پر ہم نے اسلام کا نام دے رکھا ہے۔ اسلام کونہیں بلکہ مسلمانوں کے طرز فکر کو جدید بنانے کی ضرورت ہے۔

آبنائے باسفورس

اب ہم انقرہ موٹر وے کی جانب جا رہے تھے۔گوگل ارتھ سے دیکھے گئے نقشے کے مطابق اب تک ہمیں آبنائے باسفورس کے پل تک پہنچ جانا چاہیے تھا مگر ابھی دور دور تک اس کا نام و نشان نہیں تھا۔ہمیں خطرہ لاحق ہونے لگا کہ کہیں ہم غلط سمت میں تو نہیں جا رہے۔ابھی ہم با آواز بلند یہ سوچ ہی رہے تھے کہ لندن برج کی طرز کے دو طویل ٹاورز نظر آنے لگے۔ان ٹاورز کے درمیان آبنائے باسفورس کا پل نظر آ رہا تھا۔ ان ٹاور کو ملانے والے لوہے کے رسے پل کو تھامے ہوئے تھے۔

کہنے کو تو یہ پل محض ایک شہر کے ایک حصے کو دوسرے حصے سے ملاتا ہے مگر درحقیقت یہ پل ایشیا کو یورپ سے ملا رہا تھا۔ہم اس وقت یورپ میں تھے۔اس پل کو پار کر کے ہم ایشیا میں داخل ہو جاتے۔اس پل کا نام "سلطان محمد فاتح برج" رکھا گیا تھا۔

جیسے ہی ہم پل پر پہنچے ایک عجیب منظر ہمارے سامنے تھا۔ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ ہم ایک

بہت بڑے پہاڑی دریا کے اوپر سے گزر رہے ہیں۔ دونوں جانب سبزے سے ڈھکے پہاڑوں کے درمیان نیلے رنگ کا ایک بہت بڑا دریا گزر رہا تھا۔ یہ دریا، عام پہاڑی دریاؤں کی طرح پرشور نہیں تھا بلکہ اس کا پانی نہایت ہی پرسکون تھا۔ پل کو اتنی بلندی پر بنایا گیا تھا کہ اس کے نیچے سے بحری جہاز بڑے آرام سے گزر سکتے تھے۔ میری اہلیہ نے اس خوبصورت منظر کو کیمرے کی آنکھ سے محفوظ کرنے کی کوشش کی مگر کیمرے میں کسی خرابی کے باعث اچھی تصویر نہ آ سکی۔ اس دن ہمارے ساتھ یہی ہوا۔

پل پار کرتے ہی ٹول پلازہ آ گیا۔ یہاں ٹول ٹیکس کی ادائیگی کے لئے آٹو میٹک کیمرے نصب کیے گئے تھے جو خود بخود گاڑی کا نمبر نوٹ کر کے ٹول ٹیکس کو مالک کے اکاؤنٹ سے ایڈجسٹ کر لیتے۔ اس کی رقم پہلے ہی گاڑی کے کرایے میں شامل کر لی گئی تھی۔

ترکی کی موٹر وے

اب ہم باقاعدہ موٹر وے پر سفر کر رہے تھے۔ ترکی میں صرف دو موٹر وے ہیں۔ ایک استنبول اور انقرہ کے درمیان اور دوسری جنوب میں غازی انٹپ اور انطالیہ کے درمیان۔ اس موٹر وے کا معیار اچھا تھا مگر اس کے مقابلے میں ہماری موٹر وے کافی بہتر ہے۔ سڑک کے دونوں کناروں پر ایمرجنسی لین بہت ہی تنگ تھی جس کی وجہ سے تنگی داماں کا احساس ہو رہا تھا۔ سعودی عرب کی عام سڑکوں پر بھی تقریباً ایک لین کے برابر ایمرجنسی لین چھوڑی جاتی ہے جس کی وجہ سے کھلے پن کا احساس ہوتا ہے۔ موٹر وے پر رات کی ڈرائیونگ میں مدد کرنے والے اسٹڈ نصب نہیں کیے گئے تھے۔

ترکوں کی ڈرائیونگ کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ اچھے ڈرائیور نہیں ہوتے۔ یہ تبصرہ اہل مغرب کے معیار کے مطابق ہے ورنہ پاکستان اور سعودی عرب کی نسبت یہاں ڈرائیونگ کا

معیار کافی بہتر تھا۔ گاڑی میں ڈیزل اب ختم ہونے کے قریب تھا مگر دور دور تک کسی پٹرول پمپ کے آثار نظر نہ آ رہے تھے۔ اگر کہیں پر پٹرول اسٹیشن موجود بھی تھا تو وہ موٹر وے سے ہٹ کر سروس لین پر تھا۔ استنبول سے باہر نکلتے ہی ہمیں ایک ریسٹ ایریا نظر آیا۔ میں نے گاڑی یہاں موڑ لی۔ ٹنکی فل کروانے پر ایک سو ایک لیرا خرچ ہوئے۔ یہاں صاف ستھرے باتھ روم بھی بنے ہوئے تھے۔ قریب ہی لکڑی کی بنی ہوئی مسجد تھی اجس میں مرد و خواتین کے لئے علیحدہ علیحدہ کمرے تھے۔

وضو کر کے نماز ادا کرنے کے بعد ہم آگے چلنے لگے تو ماریہ نے چپس کی فرمائش کر دی۔ میں نے یہاں موجود مارکیٹ سے چپس کا ایک بڑا پیکٹ خریدا۔ کاؤنٹر پر موجود ادھیڑ عمر خاتون سے اس کی قیمت پوچھی۔ کہنے لگیں، ''تین لیرا۔'' میں نے پانچ لیرا کا نوٹ دیا۔ پھر بولیں، ''آپ کہاں سے آئے ہیں؟'' میں نے کہا، ''پاکستان سے۔'' انہوں نے تین کی بجائے دو لیرا کاٹ کر تین لیرا مجھے واپس کر دیے۔

اب ہم دوبارہ موٹر وے پر سفر کر رہے تھے۔ " گبزے "اور " تاوشانسل " کے شہروں سے گزر کر ہم اب ازمت کی طرف بڑھ رہے تھے۔ اچانک ہی ایک نہایت دلفریب منظر ہمارے سامنے آ گیا۔ موٹر وے اونچے نیچے پہاڑوں سے گزر رہی تھی۔ یہ پہاڑ گھنے سبزے سے ڈھکے ہوئے تھے اور ان کے ساتھ ساتھ سمندر کا کنارہ تھا۔ یہ " خلیج ازمت " تھی جو کہ بحیرہ مرمرہ کی مشرقی شاخ پر مشتمل تھی۔ خلیج کا دوسرا کنارہ بھی ہمیں نظر آ رہا تھا۔ سمندر کے بیچوں بیچ بہت سے بحری جہازوں کے مستول نمایاں تھے۔

[جاری ہے]

اپنی شخصیت اور کردار کی تعمیر کیسے کی جائے؟

محمد مبشر نذیر

جب ہیرے کو کان سے نکالا جاتا ہے تو یہ محض پتھر کا ایک ٹکڑا ہوتا ہے۔ ایک ماہر جوہری اسے تراش خراش کر انتہائی قیمتی ہیرے کی شکل دیتا ہے۔ انسان کی شخصیت کو بھی تراش خراش کر ایک اعلیٰ درجے کی شخصیت بنانا بھی اسی قسم کا فن ہے۔ اگر آپ بھی یہ فن سیکھنا چاہتے ہیں تو اس کتاب کا مطالعہ ضرور کیجیے۔

قیمت: 150 روپے (ڈسکاؤنٹ کے بعد)

دین کے بنیادی تقاضے

پروفیسر محمد عقیل

- ☆ دین کے احکامات پر مبنی ایک کتاب
- ☆ تزکیہ نفس کرنے والوں کے لئے مشعل راہ
- ☆ دین کے اوامر و نواہی کی سائنٹفک پریزنٹیشن
- ☆ ہر حکم کی مختصر تشریح
- ☆ ہر امر کا قرآن و حدیث سے حوالہ

قیمت: 150 روپے (ڈسکاؤنٹ کے بعد)

حج کا سفر (ابلیس سے جنگ کی روداد)

پروفیسر محمد عقیل

حج کے بے شمار سفرنامے لکھے گئے ہونگے۔ اس سفرنامے کی خصوصیت یہ ہے کہ یہ حج کے مناسک کو اصل روح کے ساتھ تمثیلی پیرائے میں بیان کرتا ہے۔ یہ کتاب دونوں اقسام کے لئے لوگوں کے لئے مفید ہے جنہوں نے حج کرلیا ہو یا حج کرنے کا ارادہ رکھتے ہوں۔

قیمت: 120 روپے (ڈسکاؤنٹ کے بعد)

گھر بیٹھے کتب حاصل کرنے کے لئے اس نمبر پر ابھی رابطہ کیجیے: 03323051201

صراط مستقیم کیا ہے؟

’’ان سے کہو کہ آؤ میں تمھیں سناؤں تمھارے رب نے تم پر کیا چیزیں حرام کی ہیں:

یہ کہ اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرو، اور والدین کے ساتھ نیک سلوک کرو،

اور اپنی اولاد کو مفلسی کے ڈر سے قتل نہ کرو، ہم تمہیں بھی رزق دیتے ہیں اور ان کو بھی دیں گے۔

اور بے حیائی کی باتوں کے قریب بھی نہ جاؤ خواہ وہ کھلی ہوں یا چھپی،

اور کسی جان کو جسے اللہ نے محترم (ٹھہرایا) ہے ہلاک نہ کرو مگر حق کے ساتھ۔ یہ باتیں ہیں جن کی ہدایت اس نے تمہیں کی ہے، شاید کہ تم سمجھ بوجھ سے کام لو۔

اور یہ کہ یتیم کے مال کے قریب نہ جاؤ مگر ایسے طریقہ سے جو بہترین ہو، یہاں تک کہ وہ اپنے سن رشد (بلوغت) کو پہنچ جائے۔

اور ناپ تول میں پورا انصاف کرو، ہم ہر شخص پر ذمہ داری کا اتنا ہی بار رکھتے ہیں جتنا اس کے امکان میں ہے۔

اور جب بات کہو انصاف کی کہو خواہ معاملہ اپنے رشتہ دار ہی کا کیوں نہ ہو،

اور اللہ کے عہد کو پورا کرو، ان باتوں کی ہدایت اللہ نے تمہیں کی ہے شاید کہ تم نصیحت قبول کرو۔

نیز اس کی ہدایت یہ ہے کہ یہی میرا سیدھا راستہ ہے لہٰذا تم اسی پر چلو اور دوسرے راستوں پر نہ چلو کہ وہ اس کے راستے سے ہٹا کر تمہیں پراگندہ کر دیں گے۔ یہ ہے وہ وصیت جو تمھارے رب نے تمہیں کی ہے، شاید کہ تم کج روی سے بچو۔‘‘

(الانعام 6:151-153)